خالی پنجرہ
انتظار حسین

۱۹۹۳

نیاز احمد نے

سن فلاور پیکجز، لاہور سے چھپوا کر

سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور

سے شائع کی۔

تعداد ——— ایک ہزار

قیمت -/۹۹ روپے

اپنے دشمن اپنے دوست صفدر میر کے نام
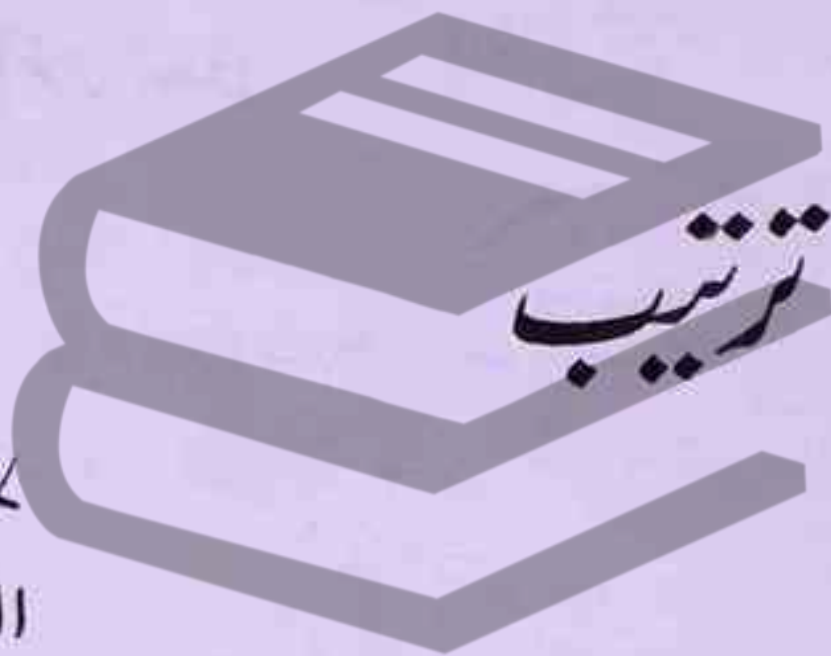
ترتیب

پیش لفظ	۷
پچھتاوا	۱۱
نرالا جانور	۲۵
تعلق	۳۷
خالی پنجرہ	۴۷
اختر بھائی	۵۲
مشکند	۵۸
گونڈوں کا جنگل	۶۸
بندر کہانی	۸۲
طوطے مینا کی کہانی	۹۲
بخت مارے	۱۰۲
داغ اور درد	۱۱۲
تذکرۂ رستخیزِ بے جا المعروف بہ فسانۂ عبرت	۱۲۲

پچھلی کہانیاں :

احسان منزل ۱۴۳

مجیدا ۱۵۵

بیریم کاربونیٹ ۱۶۲

سمجھوتہ ۱۷۹

آخری خندق ۱۸۴

پیش لفظ

قاعدے سے اس مجموعہ میں وہ سب افسانے شامل ہونے چاہئیں جو خیمے سے دور کے مرتب ہونے کے بعد لکھے گئے۔ وہ تو ہیں۔ مگر ان کے سوا بھی اس میں کچھ شامل ہو گیا ہے۔ وہ کیا اور کیسے۔

بات یہ ہے کہ میں کہانیاں لکھتے لکھتے اب اس مرحلہ میں داخل ہو گیا ہوں جہاں لکھنے والے کو تھوڑا سا عاقبت کے متعلق بھی سوچ لینا چاہئے اور محتسبوں کی طرف سے چوکنا ہو جانا چاہئے۔ پتہ نہیں کون محقق آپ کی گھات میں بیٹھا ہو اور کیا اس کا ہدف ہو۔ میرے اندر یہ خوف اس طرح سے پیدا ہوا کہ بعض اطراف سے مجھے خبردار کیا گیا کہ تم نے فلاں فلاں افسانہ بھی لکھا تھا۔ فلاں فلاں رسالہ میں چھپا تھا ہمارے پاس محفوظ ہے۔ بلکہ اپنے ایک ایسے افسانے کا میں نے انگریزی میں ترجمہ بھی دیکھا جس کے متعلق حافظہ پر بہت زور دینے کے بعد یاد آیا کہ ہاں یہ میں نے ہی لکھا تھا۔

زندگی کے سفر میں آپ کے ساتھ کتنے واقعات گذرتے ہیں۔ کتنے لوگوں سے آپ لوتے ملتے ہیں۔ سب تو آپ کو یاد نہیں رہتے۔ سب کی آپ کی زندگی میں یکساں اہمیت بھی تو نہیں ہوتی۔ یا ایک خاص گھڑی میں کسی واقعہ کسی شخص کی اہمیت ہوتی ہے۔ وہ گھڑی گذر جاتی ہے تو اس کے ساتھ وہ واقعہ وہ شخص بھی بعض اوقات گوشہ نسیاں میں کھسک جاتا ہے۔ اگر آپ کی عمر نے آپ کے ساتھ بے وفائی نہیں کی ہے تو زمانے بعد

جب ایسے بھولے بسرے دوستوں سے مڈ بھیڑ ہوتی ہے تو سوچئے کہ کیا صورت حال پیدا ہوتی ہے۔ وقت کی کرشمہ سازی سے درمیان میں اتنا فاصلہ پیدا ہو چکا ہوتا ہے کہ آپ ان کے ساتھ پہلے کی طرح گھل مل بھی نہیں سکتے۔ باہمی رشتے سے منکر بھی نہیں ہو سکتے۔ یہ زندگی ہے۔ میرے افسانے بھی میری زندگی ہی ہیں۔ بلکہ زندگی سے بڑھ کر زندگی۔

ابھی پچھلے دنوں فتح محمد ملک جرمنی جاتے جاتے مجھے خبردار کر گئے کہ آپ نے الجزائر کی جدوجہد کے زمانے میں اس اثر میں آکر کچھ افسانے لکھے تھے جن میں سے کوئی آپ کے کسی مجموعہ میں شامل نہیں ہے۔ میں ان کی تلاش میں ہوں۔

آصف فرخی ملے۔ کہنے لگے کہ ایک صاحب آپ کے کسی پرانے افسانے کا ذکر کر رہے تھے۔ بیریم کاربونیٹ۔ یہ کونسا افسانہ ہے۔ کہاں اور کب چھپا تھا۔ اور عجب ہوا کہ اس کے چند ہی دنوں بعد محمد سلیم الرحمن نے مجھ سے پوچھا کہ پروفیسر وقار عظیم نے آپ کے کسی افسانے بیریم کاربونیٹ کا ذکر کر رکھا ہے۔ یہ کونسا افسانہ ہے۔

ایک دوست نے اور ہی انداز سے پوچھا "تمہارے کسی افسانے پر کبھی انعام بھی ملا تھا۔ کونسا افسانہ تھا وہ۔

"ہاں زندگی میں ایک بار ایسا واقعہ بھی گذرا ہے 'بیریم کاربونیٹ اس افسانے کا عنوان تھا"۔

"تمہارے کسی مجموعہ میں تو شاید وہ شامل نہیں ہے۔ بیچارہ انعامی افسانہ ہونے کے چکر میں راندہ درگاہ ہو گیا"۔

"نہیں ایسی بات تو نہیں ہے۔ ادبی انعامات کا اس وقت تک ہمارے یہاں اچھا خاصا اعتبار قائم تھا۔ یہ غالباً ۵۸ء تھا۔ اور مجلس ترقی ادب جس نے یہ انعام دیا تھا اس وقت اسے بھی بہت وقار اور اعتبار حاصل تھا۔ پتہ نہیں مجموعہ میں شامل ہونے سے کیسے رہ گیا۔ شاید میری سٹرپیٹز میں رہ گیا"۔

اس افسانے کے سلسلہ میں تو شاید صورت یہی تھی۔ ویسے کتنے افسانے ایسے تھے جنہیں میں نے جان کر گم کیا کچھ خود گم ہو گئے۔ بات یہ ہے کہ لکھنے کے عمل میں اچھا برا

بہت کچھ لکھا جاتا ہے۔ وہ تو جب لکھنے والا سنجیدگی کے ساتھ مجموعہ مرتب کرنے بیٹھتا ہے اس وقت اس پر کھلتا ہے جیسے مجھ پر کہ اٹرم سٹرم کتنا لکھا گیا۔ اس وقت کوشش میری یہی ہوتی تھی کہ اس اٹرم سٹرم کو اس طرح گم کیا جائے کہ کسی دوست کو کبھی پتہ ہی نہ چلے کہ وہ گھٹیا مال گیا کہاں۔ اب اس انتخاب واسترداد میں بھول چوک بھی ہو سکتی ہے اور شاید ہوئی بھی ہو۔ یعنی جو افسانے رد کیے گئے ان میں اکا دکا ایسا بھی ہو کہ یکسر رد کرنے کے لائق نہ ہو۔ جنہیں شرف انتخاب بخشا گیا ہے ان میں ایسے بھی ہو سکتے ہیں اور ہیں جنہیں مسترد ہو جانا چاہیے تھا۔

اور جو افسانے خود گم ہو گئے یعنی اس طرح کہ مجموعہ مرتب کرنے بیٹھا ہوں اور بعض افسانے کے تراشے یا نقلیں محفوظ نہیں ہیں۔ الکساہٹ کہ کہاں رسالہ کے فائلوں میں خاک چھانیں اور اسے برآمد کریں۔ اٹرم سٹرم جو بندہ گیا سو موتی۔ جو رہ گیا سو رہ گیا۔ اب زمانے بعد جب میں یہ نیا مجموعہ مرتب کرنے بیٹھا ہوں تو ایسے کچھ افسانے خود ہی میرے کاغذوں میں سے برآمد ہو گئے ہیں۔ اب میں ان کا کیا کروں۔ وہی زمانہ پہلے بچھڑے دوستوں کی سی صورت احوال ہے کہ میں پوری طرح ان کے ساتھ گھل مل بھی نہیں سکتا۔ دیدہ و دانستہ انہیں گم بھی نہیں کر سکتا۔ 'بیریم کاربونیٹ' کے متعلق میں نے سوچا کہ اتنے لمبے زمانے کے بعد جب دوستوں کے نوٹس میں یہ آ ہی گیا ہے تو اب اسے گم کرنا خوب نہیں۔ باقی اسے پڑھ کر وہ جو بھی رائے قائم کریں۔ پھر یہ پچھلا لکھا ہوا افسانہ تازہ لکھے ہوئے افسانوں کے بیچ اکیلا اور اجنبی محسوس نہ کرے' یہ سوچ کر میں نے اگلے پچھلے لکھے ہوئے چند اور افسانے جو اس وقت میرے سامنے تھے اس کا ساتھ دینے کے لیے مجموعہ میں شامل کر دیے۔

باقی یہ لازم تو نہیں ہے کہ اب جو آپ نے لکھا ہے اس کا حرف حرف پچھلے لکھے ہوئے پر فوقیت رکھتا ہو۔ ہو سکتا ہے کہ کوئی قاری اتنا سنگدل اور اتنا انصاف پسند بھی ہو کہ لگی لپٹی رکھے بغیر کہہ دے کہ اس زمانے کی لکھی ہوئی فلاں کہانی سے بہتر تو فلاں کہانی ہے جو اب سے پاؤ صدی پہلے لکھی گئی تھی مطلب یہ ہے کہ لکھنے والے کو اپنی رائے پر بہت

بھروسہ نہیں کرنا چاہئے اور یہ طے کر کے نہیں بیٹھ جانا چاہئے کہ اس نے وقت کے ساتھ فکروفن کی سطح پر بہت منزلیں مار لی ہیں اور اس لئے پہلے کے مقابلہ میں اب زیادہ مستند ہے اس کا فرمایا ہوا۔ کچھ کام قاری کے لئے بھی چھوڑ دینے چاہئیں کہ آخری فیصلہ تو اسی کے ہاتھ میں ہے۔

انتظار حسین

لاہور

14-7-92

پچھتاوا

مادھو پیدا ہو کر بہت پچھتایا ۔ مگر اب پچھتانے سے کیا ہوتا تھا۔ پیدا تو وہ ہو چکا تھا۔ اصل میں وہ ماں کے بھرے میں آگیا۔ عجیب بات ہے کہ ماں ہی کی باتوں سے اس کے اندر یہ بات بیٹھ گئی کہ آدمی کو پیدا ہی نہیں ہونا چاہئے اور ماں ہی کی باتوں میں آکر وہ پیدا ہونے پر رضامند ہو گیا۔ اسی پچھتاوے میں جب وہ اپنے سارے اگلے پچھلے کو کرید رہا تھا دھیرے دھیرے کر کے اس پر یہ بات کھلی کہ بس وہ سوال کر کے پھنس گیا۔ ساری خرابی اس سوال سے پیدا ہوئی ۔ مگر سوال اس نے ایسا کونسا بھاری کیا تھا ۔ اتنا ہی تو پوچھا تھا کہ ماں تو دن رات کڑھتی کیوں رہتی ہے۔ ماں نے دکھی ہو کر کہا کہ میرے لال تو تو ابھی پیدا ہی نہیں ہوا ہے ۔ ماں کے پیٹ میں نچنت بیٹھا ہے۔ جب خیر سے میں تجھے جنوں گی اور تو آنکھیں کھول کر اس دنیا کو دیکھے گا پھر تجھے پتہ چلے گا کہ یاں پہ کتنے دکھڑے بکھیڑے ہیں"۔

"دکھڑے بکھیڑے جائیں بھاڑ میں ۔ ماں تو سکھی رہا کر"۔

"لال ' مجھ دکھیا کے بھاگ میں تو دکھ لکھے ہیں"۔

"اور سکھ"؟

"سکھ"۔ رکمنی نے ٹھنڈا سانس بھرا "سکھ یاں کہاں ہے"۔

وہ یہ بات سن کر بہت بیکل ہوا۔ پوچھا "ماں ' تو یہ کیا کہہ رہی ہے ۔ سکھ کیا دنیا میں ناپید ہے۔ آخر کہیں تو ہو گا"۔

"میرے لال، سکھ ماں کی کوکھ تک ہے۔ آگے دکھ ہی دکھ ہے"۔

"ماں، پھر لوگ پیدا کیوں ہوئے چلے جا رہے ہیں"۔

"مورکھ جو ہوئے۔ ہبڑ دبڑ پیدا ہوئے چلے جا رہے ہیں۔ پہلے پیدا ہو جاتے ہیں۔ پھر اپنی جان کو روتے ہیں"۔

"پھر پیدا ہونے اور جینے میں کیا فائدہ ہے"۔

"کوئی فائدہ نہیں۔ گھاٹا ہی گھاٹا ہے"۔

مادھو ماں کی باتیں سن کر دُبدا میں پڑ گیا۔ ایک سوال نے اسے آپکڑا کہ پیدا ہوا جائے یا نہ ہوا جائے۔ بہت ادھیڑ بن کے بعد آخر اس نے ایک فیصلہ کر لیا۔ سوچا کہ چلو اچھا ہوا، ماں کے پیٹ ہی میں اصلی بات کا پتہ چل گیا۔ ابھی تو تیر کمان میں ہے۔ میں پیدا ہی نہیں ہوتا۔ گھاٹے کا سودا میں کیوں کروں۔

رکمنی بھولی بھالی عورت تھی۔ اسے پتہ ہی نہ چلا کہ اس کی کھوکھ میں کیا گل کھلا ہے اور ہونے والا کیا سوچ رہا ہے۔ آسوں مرادوں کے ساتھ اس نے نو مہینے پورے کئے اور بچہ جننے کے لئے تیار ہوئی۔ مگر بچہ نے تنت وقت پہ پیدا ہونے سے انکار کر دیا۔ رکمنی تو پیٹ پکڑ کے بیٹھ گئی کہ یہ کیا ہوا۔ اس بات کا تو اسے سان گمان بھی نہیں تھا۔ ہوش ذرا ٹھکانے آئے تو بولی "میرے لال، یہ تیرے جی میں کیا سمائی ہے۔ یہ تو انہونی بات ہے۔ جو بالک پیٹ میں آ گیا اسے پیدا بھی ہونا ہوتا ہے۔ ماں کی کوکھ تو بالک کو بس نو مہینے تک سنبھالتی ہے میں نے نو مہینے پورے کر لئے سو میرے لال جی اب تم باہر آؤ، آنکھیں کھولو اور دنیا کو دیکھو۔"

"نہیں ماں، میں اس اندھیر نگری میں جہاں دکھ ہی دکھ ہے آنکھیں نہیں کھولوں گا، چاہے میری ساری عمر تیری کوکھ میں پڑے پڑے بیت جائے"۔

رکمنی نے بہت سمجھایا بجھایا۔ مگر بالک اپنی ہٹ پہ آ گیا تھا۔ کوکھ میں دھرنا دے کے بیٹھ گیا۔

جب بہت دن بیت گئے اور رکمنی اتنی بھاری ہو گئی کہ اٹھنا بیٹھنا اس کے لئے دو بھر

ہو گیا تو پھر اس نے پتی سے رو رو کے کہا "بچے کا بوجھ مجھے لے بیٹھے گا"۔

گنپت پتنی کی تکلیف دیکھ کر بیکل ہو گیا۔ کہا کہ "وید جی سے جا کے کہتا ہوں۔ وہ کوئی دارو کریں گے"۔

"وید جی کی دارو کیا کام دے گی جب بالک ہی پیدا ہونے پہ راضی نہیں ہے"۔

گنپت کی سمجھ میں یہ بات نہ آئی۔ چکرا کر پتنی کو دیکھنے لگا۔

رکمنی نے کہا "سوامی، اسے سمجھاؤ"۔

"کسے سمجھاؤں"۔

"اپنے بالک کو"۔

"بالک کو؟..... وہ تو پیٹ میں ہے"۔

"یہی تو اسے سمجھانا ہے کہ پیٹ میں بہت رہ لیا۔ اب باہر نکلے"۔

"اری کچھ تیری مت ماری گئی ہے۔ کیسی بہکی بہکی باتیں کر رہی ہے"۔

"سوامی میں تمہیں کیسے سمجھاؤں۔ تمہارا بالک پیدا ہونے کے لئے تیار نہیں ہے۔ نرالا بالک ہے۔ پیٹ میں دھرنا دے کے بیٹھ گیا ہے پیدا ہونے سے انکار کرتا ہے"۔

گنپت بہت چکرایا۔ پہلے تو اس نے یہ بات ماننے ہی سے انکار کر دیا مگر جب رکمنی نے مادھو کی باتیں سنائیں تو سوچ میں پڑ گیا۔ اس نے ویدوں پرانوں کو بہت چھانا تھا۔ دھیرے دھیرے کر کے بات اس کی سمجھ میں آگئی۔ سوچ کر بولا "ہے تو یہ انوکھی بات۔ پر سوچو تو اتنی انوکھی بھی نہیں۔ گاندنی نے بھی اسی پرکار پیدا ہونے سے انکار کر دیا تھا"۔

رکمنی نے چکرا کر پوچھا "گاندنی کون تھی"؟

"گاندنی ورشنی کے پتر شپھلک کی پتری تھی۔ ماں کے پیٹ میں اڑ کے بیٹھ گئی۔ مہینے چڑھے پھر برس چڑھا۔ پھر دوسرا برس چڑھا۔ پھر تیسرا برس آن لگا۔ پتری تھی کہ پیٹ میں پھرتی تھی، پیدا نہیں ہوتی تھی۔ کہتی تھی کہ مجھے پیدا ہونا ہی نہیں ہے"۔

"پھر کیا ہوا۔ پیدا ہوئی یا نہیں ہوئی"

"پیدا کیسے نہ ہوتی۔ پیدا تو ہونا ہی پڑتا ہے۔ جو بچہ پیٹ میں آگیا وہ بھاگ کے کہاں

جائے گا۔ پیدا ہووے ہی ہووے پر اس نے ستایا بہت۔ پیدا ہونے کے لئے شرتیں رکھنی شروع کر دیں"۔

"وہ کیا شرتیں تھیں"۔

"شرط بس ایک تھی۔ اسی پہ اڑی ہوئی تھی۔ پتا نے کہا پتری زیادہ پیر مت پھیلا۔ بس یہ تیری ماتا کی کوکھ ہے' وشنو جی کا وشال پیٹ نہیں ہے۔ میرا کہا مان اور پیدا ہو جا۔ وہ بولی' ایک شرط پہ جنموں گی۔ پوچھا وہ کیا شرط ہے۔ کہا میں روز ایک گیا برہمنوں کو دان دیا کروں گی۔ یہ شرط پوری کرنے کا وچن دو تو پھر میں جنموں گی۔ پتا نے کہا' چل تیرا کہا مان لیا۔ اب دیر مت کر۔ پیدا ہو جا۔ بس وہ ترنت ہی پیدا ہو گئی۔ اور پیدا ہوتے ہی گھر میں بندھی ہوئی گئیں دان دینی شروع کر دیں"۔

رکمنی نے کہا "اپنے مادھو سے بھی پوچھ لو کہ اس کی کیا شرط ہے۔ جو شرط رکھے مان لو۔ مجھ سے اب اسے سہارا نہیں جاتا۔

گنپت نے بیٹے کو پکارا "پتر' یہ ماں کا پیٹ ہے۔ تمہارے باپ کا گھر نہیں ہے۔ بہت ہو چکی' اب پیدا ہو جاؤ۔ خود بھی جیو' ماں کو بھی جینے دو"۔

مادھو نے کوکھ میں لیٹے لیٹے پکار کے کہا "پتا جی' پیدا ہو کے میں کیا لوں گا۔ پیدا ہونے کا فائدہ کیا ہے۔ جیون میں تو دکھ ہی دکھ ہے"۔

گنپت بیٹے کے اس جواب پر اپنا سا منھ لے کے رہ گیا۔ رکمنی سے بولا "اری بھاگوں بھری' تیرے پوت کے تو گومڑلال والے لچھن ہیں۔

رکمنی نے پوچھا "سوامی گومڑلال کون تھا۔ اور اس کے کیا لچھن تھے"۔

"گومڑلال پراچین کال میں ایک ودھوان کا پتر تھا۔ وہ ابھی ماں کے پیٹ میں تھا کہ باپ سے ودیا میں برابری کرنے لگا۔ باپ جو بات کہتا' یہ اس سے جرح کرنے لگتا۔ ایک دن باپ کو تاؤ آگیا کہ میں اتنا بڑا ودھوان اور یہ ڈیڑھ بالشت کا چھوکرا ابھی ماں کے پیٹ میں ہے اور مجھ سے بحث کرتا ہے۔ اسی تاؤ میں پتنی کی کوکھ پر لات ماری۔ لات سیدھی بالک کے سر پہ پڑی۔ چوٹ سے اس کے سر پہ گومڑ پڑ گیا۔ اسی سے وہ گومڑلال کہلانے

لگا"۔

"پر وہ پیدا تو ہو گیا تھا نا"؟

"پیدا تو وہ اپنے سمے سے پہلے ہی ہو گیا اور ایسا پیدا ہوا کہ ویدوں کا ورنن کرتا پیٹ سے نکلا۔ باپ کہیں جیتا ہوتا تو اس کی ودیا کے سامنے پانی بھرتا۔ پر اس کا تو پہلے ہی دیہانت ہو چکا تھا۔ ہوا یوں کہ وہ راج دربار کے چاتر ودھوانوں کے چکر میں آگیا اور ان سے مات کھا گیا۔ یہ ہار اسے کھا گئی۔ ندی میں جا کے ڈوب مرا۔ گومڑ جب سیانا ہوا تو ماں نے اسے بتایا کہ تیرے پتا کے ساتھ کیا ہوا۔ اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ' سیدھا راج دربار میں جا دھمکا للکارا کہ میں ان چاتر ودھوانوں سے بحث کروں گا جو میرے پتا کی موت کا کارن بنے ہیں۔ راجہ نے کہا کہ بالک ہاتھیوں سے گنے مت کھا۔ تو ابھی کچی دھات ہے۔ یہ میرے دربار کے رتن اپنے ہنر میں منجھے ہوئے ہیں۔ پر گومڑ لال ایک ایک پانی کرنے پہ تلا ہوا تھا۔ ایک ایک پانی کر کے مانا۔ راج دربار کے ودھوانوں نے ناک رگڑی اور ہار مان لی"۔

رکمنی یہ کہانی سن کر بولی کہ پتا کا اس نے اپمان کیا۔ پر پیدا تو ہو گیا۔ تمہارا لاڈلا تو پیدا ہونے ہی کے لئے تیار نہیں۔ ارے اسے کسی پرکار پیدا ہونے پہ راضی کرو"۔

"بھاگوں بھری' میں اسے کیسے راضی کروں۔ اس نے ایسا سوال کر ڈالا ہے۔ جس کا جواب میرے پاس تو ہے نہیں۔ پوچھتا ہے کہ پیدا ہونے کا کیا فائدہ ہے۔ بھلا میں اس کا کیا جواب دوں۔ اس کا جواب تو رشیوں منیوں کے پاس بھی نہیں ہے"۔

"اچھا میں اس کرم جلے کی بات کا جواب دیتی ہوں"۔ جل بھن کر بولی اور پھر اپنی کوکھ والے سے مخاطب ہوئی" بالک بتا تو نے اپنے باپ سے کیا پوچھا تھا"۔

"ماں میں نے باپ سے یہ پوچھا تھا کہ پیدا ہونے کا آخر فائدہ کیا ہے"۔

"مورکھ میں تجھے بتاتی ہوں کہ پیدا ہونے کا کیا فائدہ ہے۔ فائدہ یہ ہے کہ میرا پنڈ تجھ سے چھوٹ جائے گا اور میرے پیٹ کا بوجھ ہلکا ہو جائے گا"۔

اس بات پہ مادھو جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ کچھ بن نہ پڑا کہ ماں کی بات کا کیا جواب

دے- بس پیدا ہو گیا- مگر عجیب ہوا ' ادھر اس نے آنکھ کھولی ادھر ماں کی آنکھ بند ہو گئی - جیسے وہ اسے جننے ہی کے لئے جینے کا کشٹ کھینچ رہی تھی-

گنپت کو رکمنی سے بڑا لگاؤ تھا- وہ دنیا سے سدھار گئی تو وہ بھی ڈھتیا چلا گیا- دنوں میں وہ بھی چٹ پٹ ہو گیا- مادھو دنیا میں اکیلا رہ گیا۔تھا تو بالک پر سیانوں سے زیادہ سیانا تھا- ماں باپ کی موت پر اس نے جتنا شوک کیا اس سے زیادہ سوچ بچار کیا- رہ رہ کر سوچتا کہ اس کے جنم لینے کے ساتھ ہی ماتا پتا دونوں بیکنٹھ کو لد گئے- آخر کیوں- اس نے بہت سوچ بچار کے بعد یہ جانا کہ وہ دونوں اسی کے کارن دنیا سے سدھارے- نہ وہ دنیا میں آتا نہ وہ دونوں دنیا سے جاتے- ایک جیو آیا اور دو جیو چلے گئے- اور جیو بھی کیسے - گنپت اور رکمنی جیسے کہ دونوں ہیرا تھے- اور میں ؟ میں تو ان کے سامنے روڑا ہوں اور اب ان کے بنا تو بالکل ہی گلی کا روڑا بن جاؤں گا- ماں نے سچ ہی کہا تھا کہ اس جگ کا جیون گھاٹے کا سودا ہے- اور وہ پچھتایا کہ وہ کیوں اس دنیا میں آیا- اگر میں ماں کی بات کا اثر نہ لیتا اور پیدا نہ ہوتا تو کتنا اچھا ہوتا- پیدا نہ ہونے کا اچھا بھلا فیصلہ کر کے ماں کے بھرے میں آگیا اور خواہ مخواہ پیدا ہو گیا-

کہتے ہیں کہ کیسا ہی گھاؤ ہو وقت اسے بھر دیتا ہے- مگر یہ کیسا گھاؤ تھا کہ جتنا وقت گذرتا جاتا تھا اتنا گہرا ہوتا جاتا تھا - اس کا یہ حال دیکھ کر کنبہ کے لوگ ایک دن اکٹھے ہو کر اس کے پاس آئے اور سمجھانے لگے کہ ماتا پتا کسی کے بھی سدا نہیں رہتے اور آنا جانا تو اس دنیا میں لگا ہی رہتا ہے - اب اس گھٹنا کو بہت دن بیت گئے ہیں اور تم سیانے ہو گئے ہو- گھر میں داتا کا دیا سب کچھ ہے- تمہارا پتا دھن دولت چھوڑ کے دنیا سے گیا ہے- بیاہ کرو اور گھر آباد کرو"-

وہ بولا "میں خود دکھی ہوں- گھر میں کسی دوسرے جیو کو لا کر کیوں دکھی کروں"-

"ارے بھاگوان ' تو کیسی باتیں کرتا ہے- آنے والی آئے گی تو جی اور سا ہو گا اور دکھ بٹ جائے گا"-

اور کنبہ کے ایک بڑے نے یہ کہا کہ "لالہ' دکھ اس اسار سنسار میں اتنا ہے کہ کوئی

اکیلی جان اسے سہار نہیں سکتی۔ اسی کارن پیدا کرنے والے نے جیو کو جوڑے جوڑے پیدا کیا ہے۔ دوسرے کی سنگت میں دکھ بٹ جاتا ہے"۔

مادھو نے کنبہ والوں کی باتیں سنیں مگر ذرا جوش سے مس ہوا ہو۔ آخر میں اس نے یہی کہا کہ "میں خود اپنے لئے بوجھ ہوں۔ میں اس بوجھ کو اتارنے کو پھر رہا ہوں۔ بیاہ کر کے ایک اور بوجھ سر لیلوں۔ نہ بابا نہ"۔

کنبہ والوں کو یہ ٹکا سے جواب دے کر اس نے چلتا کیا۔ پھر سوچا کہ باپ کا چھوڑا ہوا روپیہ پیسہ ' ڈھور ڈنگر ' کھیت مکان یہ بھی تو سب بوجھ ہی ہیں۔ یہ کھڑاگ آخر کس لئے۔ بس اس نے ترت پھرت سب کچھ برہمنوں کو دان دیدیا ' گایوں کو پن کر دیا۔ جیسے یہ سب کچھ خاک تھا کہ اس سے دامن جھاڑا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

باپ کی چھوڑی ہوئی ساری دھن دولت دان پن کرنے کے بعد مادھو نے سوچا کہ بس اب ایک جنم بھار رہ گیا ہے۔ اسے بھی اتار دوں تو بالکل ہلکا ہو جاؤں گا مگر کیسے اتاروں۔ اس چکر میں وہ نگر سے نکل کھڑا ہوا۔ کتنے دنوں تک نگر نگر اور ڈگر ڈگر مارا مارا پھرتا رہا۔ پھرتا پھراتا ایک جنگل بیابان میں جانکلا۔ دور دور تک آدمی نہ آدم زاد۔ پر تھوڑی دیر میں ایک ہرے بھرے پیڑ پہ نظریں جم گئیں۔ اس کی چھاؤں میں اک ہری بھری ناری بیٹھی دھاروں دھار رو رہی تھی۔ اسے دیکھ کر من میں کن من کن من ہونے لگی۔ پر فوراً ہی سنبھل گیا۔ سوچا کہ یہ تو میں ناری جال میں پھنسنے لگا ہوں۔ اس سے کنی کاٹی اور قدم مارتا آگے نکل گیا۔ بہت آگے نکل آیا تو پھر ٹھٹھکا اس بن میں جہاں دور دور تک آدمی کا پتہ نہیں ہے۔ یہ ناری کیسے آئی اور کیوں رو رہی ہے۔ ضرور اس پہ کوئی بپتا پڑی ہے۔ اس سے مجھے پوچھ تو لینا چاہئے ' کہ تجھ پہ کیا مصیبت پڑی ہے کہ یہاں اکیلی بیٹھی ٹسر ٹسر رو رہی ہے۔ اگر میں اس کی کوئی مدد کر سکتا ہوں تو کرنی چاہئے۔ آخر آدمی ہی آدمی کے کام آتا ہے۔ سو وہ جس تیزی سے کنی کاٹ کر آیا تھا اسی تیزی سے پلٹا جاکر ناری سے پوچھا "اے ناری تو کون ہے۔ آدمی کی بچی ہے یا کوئی اپسرا ہے۔ اس نرجن بن میں تو کیا کر رہی ہے اور کیوں یوں بلک بلک کر رو رہی ہے"۔

ناری نے سر اٹھا کر دیکھا۔ روتے روتے تھم گئی جیسے اسے دیکھ کر اس کی ڈھارس بندھ گئی ہو۔ آنسو پونچھے اور بولی" تھی تو میں اپسرا ہی مگر اپنے پھوٹے بھاگوں سے اب ناری بنکر کشٹ کھینچ رہی ہوں"۔

"یہ کس کارن ہوا"۔

"ہوا یوں کہ اس بن میں ایک رشی تپ کر رہا تھا۔ اندر دیوتا اس کا تپ دیکھ کر وسوسے میں پڑ گیا۔ اپسراؤں کو بلا کر کہا کہ یہ رشی بہت بڑھ چلا ہے۔ تپ کے زور پر دیوتا بننے کے جتن کر رہا ہے۔ کون اپسرا ہے جو اسے رجھا کر اس کے تپ میں بھنگ ڈالے۔ میں نے اپنے گھمنڈ میں کہا کہ میں جاتی ہوں۔ وہ بھاؤ بتاؤں گی کہ رشی جی ساری تپ بھول جائیں گے۔ سو میں سندر ناری بن کر اٹھلاتی بھاؤ بتاتی جو بن دکھاتی اس کے سامنے آئی۔ رشی نے میرے کھیل کو تاڑ لیا۔ لال پیلی آنکھوں سے مجھے دیکھا اور سراپ دیا کہ اب تو اسی روپ میں رہے گی اور اسی بن میں خاک پھانکتی پھرے گی۔ میرے تو ہوش اڑ گئے۔ رشی کے چرنوں میں پڑ گئی۔ روئی گڑگڑائی کہ رشی جی چوک ہو گئی۔ شما کر دو۔ رشی مہاراج تھوڑے نرم پڑے اور بولے کہ اب تو میں سراپ دے چکا۔ واپس نہیں لے سکتا۔ ہاں یہ کر سکتا ہوں کہ سزا لمبی نہ کھنچے۔ سو سن کہ اس بن میں جب کوئی جوان آئے گا اور تو اس سے ملے گی تو پھر تیرا اپسرا والا روپ واپس آئے گا اور تو اس بن کی قید سے چھٹکارا پائے گی"۔

مادھو نے اس کی یہ بپتا سنی تو اس کا دل پسیج گیا پھر حیران ہو کر پوچھا "ناری تجھے کتنے دن ہو گئے یہ سزا بھگتتے"۔

ٹھنڈا سانس بھر کر بولی" مت پوچھ کہ کتنے برسوں سے یہ کشٹ کھینچ رہی ہوں۔ لگتا ہے کہ شتابدی بیت گئی"

"اس دن سے ادھر کوئی جوان آیا ہی نہیں"۔

"جوان یاں کہاں دکھائی دیتا ہے"۔ اس نے پھر ٹھنڈا سانس بھرا۔" سفید سن ایسی جٹائیں بڑھائے بڈھے پھونس رشی یہاں پہ آتے ہیں۔ سادھی لگا کر آنکھیں موند کر ایسے

بیٹھتے ہیں کہ پھر آنکھ ہی نہیں کھولتے۔ پر خیر اب تو آگیا ہے"۔ اور یہ کہتے کہتے اس کے من میں کامنا کنمنائی اور من سے نکل کر آنکھوں میں جھلملائی۔ ایسی نظروں سے مادھو کو دیکھا کہ اس کا جی ڈوب گیا۔

پر مادھو نے جلدی ہی اپنے آپ کو سنبھال لیا۔ "سندری' میں تو خود اپنے کئے کی سزا کاٹ رہا ہوں"۔

"تو نے کیا کیا تھا"؟

"میں نے بس اتنا کیا کہ پیدا ہو گیا۔ اور اب جینے کا دکھ سہہ رہا ہوں"۔

اس پر وہ ناری کھلکھلا کر ہنسی۔ بولی؟ "مجھ سے مل - سکھی ہو جائے گا"۔

وہ ایک بار پھر ڈول گیا۔ مگر پھر اپنے آپ کو سنبھالا اور جی کڑا کر کے کہا "ایک چوک کر چکا ہوں۔ دوسری چوک نہیں کروں گا"۔

"ارے مان بھی جا"۔ اس نے لجا کر کہا" تیرے بھی دلدر دور ہو جائیں گے۔ میری بھی ناری جنم سے مکتی ہو جائے گی"۔

مادھو پھر پھسلنے لگا تھا۔ مگر جلدی ہی اپنے آپ کو تھام لیا۔ دل میں کہا کہ رشی جی تو بچ کر نکل گیا۔ پر میں یاں ٹکا رہا تو پھنس جاؤں گا۔ خیر اسی میں ہے کہ یاں سے بھاگ نکلو۔ دل میں یہ ٹھان کر اس نے ناری کی بات کا جواب یوں دیا کہ کان پکڑے۔ کہا کہ "نا بابا" اور چل کھڑا ہوا۔

ناری کی آنکھوں میں جو آس کی کرن جگمگائی تھی وہ ترت کے ترت بجھ گئی۔ یاس بھری نظروں سے اسے دیکھا۔ بولی" تو کیسا مرد ہے۔ ایک ناری کو نراشا کے اندھکار میں چھوڑ کے جا رہا ہے"۔

مادھو بولا" جو خود اندھیرے میں بھٹک رہا ہو وہ کسی دوسرے کو اندھیرے سے کیا نکالے گا"۔ اور آگے بڑھ گیا۔

ناری پیچھے سے پکاری " دیکھ پچھتائے گا"۔

مادھو نے کانوں میں انگلیاں دے لیں اور آگے بڑھتا چلا گیا۔ دور نکل کر اس نے

اطمینان کا سانس لیا کہ کس طرح ناری جنجال میں پھنسنے سے وہ بال بال بچا ہے۔

مادھو چلتا رہا، چلتا رہا۔ دھول مٹی میں کنکروں پتھروں پر چلتے چلتے اس کے تلوئے چھل گئے۔ آخر ایک دن ایک سادھو کے درشن ہوئے۔ مادھو نے ڈنڈوت کیا اور اس کے چرنوں میں بیٹھ گیا۔ سادھو نے آنکھ بھر کر اسے دیکھا۔ پوچھا "بچہ تجھے کیا دکھ ہے"۔؟

"سادھو مہاراج، مجھ سے اک چوک ہو گئی"

"بچہ، کیا چوک ہو گئی تجھ سے"۔

"میں پیدا ہو گیا"۔

"پھر؟"

اس کا اپائے کیا ہے""؟

"اپائے"۔ سادھو ٹھنڈا سانس بھر کر بولا "بچہ، اسی چنتا میں تو میں بیاکل پھرتا ہوں۔ کتنے تیرتھ کئے، کتنا بنوں میں مارا مارا پھرا، کتنا گیان دھیان کیا، پر پتہ نہ چلا کہ اس جیون روگ کا اپائے کیا ہے"۔

"مہاراج، میں تو اسی یاترا پہ نکلا ہوا ہوں۔ اگر آپ نہیں بتاتے تو کسی ایسے کا پتہ بتائیے جو اس کھوج میں میری مدد کرے"۔

سادھو سوچ میں پڑ گیا۔ پھر بولا "سومیرو پربت پہ ایک رشی باس کرتا ہے۔ کتنی شتابدیوں سے اپنی سمادھی پہ آنکھیں موندے بیٹھا ہے۔ وہاں تک جانے کی ساہس ہو تو جا اور اس گیانی کے چرن چھو۔ وہی تجھے کچھ بتائے تو بتائے"۔

مادھو نے سومیرو پربت پہ جانے کا بیڑا اٹھایا اور چل پڑا۔ نہ دن کو دن سمجھا نہ رات کو رات جانا بس جاڑا، گرمی، برسات، کسی رت کو نہ گردانا۔ بس چلتا رہا۔ مرتا گرتا ٹھوکریں کھاتا آخر اس اونچے پربت پہ پہنچ ہی گیا۔

دیکھا کہ ایک گپھا میں ایک بوڑھا آنکھیں موندے بیٹھا ہے بالکل پھونس کہ پھونک مارے سے اڑ جائے۔ جٹائیں سفید برف سمان، وہ ہاتھ جوڑ کر سر نیوڑھا کر کھڑا ہو گیا۔ دیر بعد بوڑھے نے آنکھیں کھولیں۔ مادھو کو غور سے دیکھا "بچہ تو کون ہے۔ یاں کیا لینے آیا

ہے"۔

"دکھی ہوں۔ دارو کے کھوج میں آیا ہوں"۔

"کیا دکھ ہے تجھے؟"

"جیون دکھ"۔

"جیون تیرے لئے دکھ کس کارن بنا"۔

"اک چوک ہو گئی"۔

"کیا؟"

"سوچا تھا کہ پیدا نہیں ہوں گا۔ پر ماتا پتا کے کارن پیدا ہونا پڑ گیا"۔

"مورکھ پیدا تو ہونا پڑتا ہے"۔

"اور اس سے جو دکھ پیدا ہوتا ہے"۔

"وہ سہنا پڑتا ہے"۔

"پر رشی مہاراج اس کا کوئی اپائے بھی تو ہو گا"۔

"مارا مارا مت پھر۔ بیٹھ جا"۔

وہ بیٹھ گیا اور بولا" رشی مہاراج میں بیٹھ گیا"۔

"آنکھیں بند کر لے"۔

اس نے آنکھیں بند کر لیں اور بولا "رشی مہاراج میں نے آنکھیں بند کر لیں"۔

"کان بند کر لے"۔

اس نے کان بند کر لئے اور کہا "رشی مہاراج میں نے کان بند کر لئے"۔

"چپ ہو جا"۔

وہ چپ ہو گیا۔ بالکل چپ - دن گذرتے گئے اور وہ چپ بیٹھا رہا۔ بالکل گم سم۔ جانے کتنے دن کتنے برس - اسے لگا کہ صدیاں بیت گئیں - آخر آنکھ کھولی اور بولا" مہاراج، اب تو بہت سمے بیت گیا"۔

"سمے؟" رشی نے آنکھیں کھولیں اور حیرت سے مادھو کو دیکھا" مورکھ تو ابھی تک

سمے کے چکر سے نہیں نکلا"؟

"نکلنے لگا تھا کہ اس نے ستانا شروع کر دیا"۔

"کس نے؟"

"ناری نے"۔

"کون تھی وہ؟"

اس نے وہ ساری کہانی سنائی اور کہا "جب اس نے آخری بار میری طرف دیکھا تھا تو اس کی نظروں میں کتنی نراشا تھی۔ ان نظروں کو میں نہیں بھول پا رہا"۔

رشی نے غصے سے اسے دیکھا "مورکھ جیون بھار کیا تھوڑا تھا کہ ایک اور بوجھ تو نے اپنے دم کے ساتھ لگا لیا۔ جا پہلے اس بوجھ کو اتار۔ اور پھر آ"۔

"بوجھ کو اتار دوں۔ پر کیسے"؟

"اسی ناری کے پاس جا۔ ہلکا ہو کے آ"۔

وہ بہت سٹپٹایا "مہاراج سمے بہت بیت گیا ہے اور میں برف سے ڈھکے اس پربت پہ بیٹھے بیٹھے سیل چکا ہوں"۔

"پر چنگاری تو تیرے اندر ابتک سلگ رہی ہے"۔

وہ رو پڑا "یہی تو مشکل ہے۔ یہ کیسے بجھے"۔

"وہ ہی بجھا دے گی۔ جا یاں سے۔ بجھ جائے تو آ جائیو"۔

کتنی بے دلی سے اٹھا۔ مگر جب چلنے لگا تو پکے ارادے کے ساتھ بولا "بس گیا اور آیا"۔

جس راستے آیا تھا اسی راستے واپس چلا۔ چلتے چلتے اسے اچھے برے خیالوں نے آگھیرا۔ اگر یہی بات تھی تو میں نے اسے کیوں انکار کیا۔ اچھا ہوتا کہ اسی گھڑی اسے بھگتا دیتا۔ وہ بھی سکھی ہو جاتی۔ مجھے بھی کامنا سے مکتی مل جاتی۔ یہ کشٹ کہ اب کھینچ رہا ہوں کیوں کھینچنا پڑتا۔ ہاں بالکل۔ اچھا ہی ہوتا۔ اس نے کتنا سمجھایا رجھایا پر میں ہی ...... اس کی ایک ایک بات ایک ایک ادا اسے یاد آئی اور بیکل کرتی چلی گئی۔ اس کے قدم تیزی

سے اٹھنے لگے۔ قدموں میں جیسے بجلی بھر گئی ہو۔ چل کیا رہا تھا' دوڑ رہا تھا۔

جب اس بن میں پہنچا تو دل بلیوں اچھلنے لگا بھلا وہ کونسا برکش تھا جس کی چھاؤں میں وہ براجتی تھی۔ جس کی شاخیں ہری بھری اور چھاؤں گھنی دیکھی اسی پر گمان ہوا کہ یہاں تھی وہ پر وہ تو اب یاں پہ کہیں دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ ایک ایک پیڑ تلے دیکھا۔ کہیں نہیں تھی۔ ہے رام وہ کہاں الوپ ہو گئی۔ کیا مجھے دیکھ کر چھپ گئی ہے - اری سندری کیوں جوگی کو تڑپاتی ہے۔ کس بیکلی کے ساتھ ایک ایک کنج میں جھانکا - پورا بن چھان مارا۔ کہاں گئی سندری۔ زمین کھا گئی یا آسمان چاٹ گیا۔ اور بن جو اسے ہرا بھرا دکھائی دے رہا تھا اجاڑ لگنے لگا' جیسے ایک دم سے پت جھڑ لگ گئی ہو۔

بہت دوڑ دھوپ کے بعد ایک اجڑے پت جھڑ کے مارے پیڑ تلے ایک جوگی دکھائی دیا کہ انگ پہ بھبھوت ملے دھونی رمائے بیٹھا تھا۔ چلو کوئی آدمی آدم زاد نظر تو آیا۔ سوچا کہ شاید اس سے کھوئے نگینہ کا کھوج ملے جاکر اس کے پیر چھوئے - جوگی نے اس کا حال دیکھ کر ترس کھایا۔ کہا کہ "بچہ تو بہت چلا ہے۔ بیٹھ جا"۔

وہ بیٹھ گیا۔

"اس اجاڑ بن میں کس کارن مارا مارا پھرتا ہے"

"جوگی جی یاں پہ ایک ناری تھی۔ یہیں کہیں ایک پیڑ تلے براجی ہوئی تھی۔ اب آیا ہوں تو وہ مل نہیں رہی۔ کچھ اس کا پتہ ہو تو بتاؤ"۔

"وہ ناری کون تھی اور تو کون ہے"۔

جواب میں اس نے اپنی ساری رام کہانی سنا ڈالی۔ جوگی نے ساری کہانی سنی - پھر افسوس کرتے ہوئے کہنے لگا "جس یاتری کے رستے میں ناری آنکلے اور آکر نکل جائے پھر اسے بہت ٹھوکریں کھانی پڑتی ہیں اور بہت پچھتانا پڑتا ہے"۔

"جوگی جی' پھر میں کیا کروں"۔

"اسے ڈھونڈ"۔

"بہت ڈھونڈا"۔

"اور ڈھونڈ"۔

"کتنا تو ڈھونڈ لیا۔ کب تک ڈھونڈوں"۔

"مورکھ، ڈھونڈنے والے یہ نہیں پوچھا کرتے بس ڈھونڈتے رہتے ہیں"۔

مادھو یہ سن ترنت اٹھ کھڑا ہوا اور آگے چل پڑا۔ ایک ایک پیڑ تلے جھانکتا اور آگے بڑھ جاتا اسی میں کتنی دور نکل گیا سومیرد پربت اب بہت پیچھے رہ گیا تھا۔ وہ آگے بڑھتا ہی چلا جا رہا تھا۔ چلتے چلتے پاؤں چھل گئے، سوجھ گئے پر وہ چلتا چلا گیا، تب بھی یوں لگتا کہ وہ صدیوں سے چل رہا ہے، بھٹکتا پھر رہا ہے تھوڑا ٹھٹھکتا اور سوچتا کہ اس یاترا کا کوئی انت بھی ہے یا نہیں اور پھر چل پڑتا۔ مگر انت کہاں، رستہ تو الجھتا لمبا ہوتا ہی چلا جا رہا تھا۔ اور رستہ جتنا الجھتا لمبا ہوتا گیا اتنا ہی اس کا پچھتاوا بڑھتا چلا گیا۔

❁ = = = = = = = ❁

نرالا جانور

زمانوں اور زمینوں میں گھومتے پھرتے ویاس جی کو ایک لہر آئی کہ ہستنا پور کی طرف ہو لئے اور راجہ جنمی جے کے دربار میں جا براجے جنمی جے اس درشن پہ خوشی سے پھولا نہ سمایا۔ سنگھاسن سے اتر کر اس مہان آتما کو سنگھاسن پہ بٹھایا اور چاندی کے لگن میں گلاب کیوڑے کے مہکتے پانی سے ان کے پیر دھوئے۔ ویاس جی نے اس کے سر پہ ہاتھ پھیرا اور اشیر واد دی۔

جنمی جے کے دماغ میں کب سے ایک پھانس کھٹک رہی تھی۔ اس کے پرکھوں کو کیا ہو گیا تھا کہ لڑ لڑ کے کٹ مرے کہ نسلیں ختم ہو گئیں۔ کیوں ان بدھیمانوں کی بدھی میں اتنی سی بات نہیں آئی کہ جنگ میں کوئی جیتے کوئی ہارے پر تباہی سب پر آتی ہے۔ پر کون تھا جس سے وہ یہ پوچھتا۔ سنی سنائی سے اس کی تسکین نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ تو کسی ایسے سے پوچھنا چاہتا تھا۔ جس نے وہ سب کچھ دیکھا۔ پر ایسا اب کون تھا۔ جنمی جے مہابھارت کے بعد کی دوسری پیڑھی میں سے تھا۔ جب اس نے ہوش سنبھالا تو مہابھارت کے بڑے بوڑھے کہانی بن چکے تھے۔ اس زمانے کی کہانیاں ان گنت تھیں، پر آدمی اب کوئی باقی نہیں تھا۔ اب جو ویاس جی نے درشن دیئے تو اس کی آنکھوں میں روشنی آئی اور ساتھ ہی دماغ میں اڑی پھانس اور زیادہ کھٹکنے لگی۔ اسے لگا کہ اب اسے اپنے سوال کا جواب مل جائے گا کہ اس کے بڑوں کا بڑا اس کے سامنے آن موجود ہوا تھا، وہ جس کے تئیں مہا

بھارت کے سب بڑے بچے تھے۔

جنمی جے ویاس جیؒ کے چرنوں میں بیٹھ گیا۔ ادب سے بولا" رشی مہاراج میں تو زمانے بعد پیدا ہوا تھا۔ آپ نے تو سب کچھ اپنی آنکھ سے دیکھا تھا اور پھر وہ سب آپ ہی کی سنتان تھے۔ کچھ مجھے بتاؤ کہ انہیں کیا ہو گیا تھا کہ کورو کشیتر میں تو نیزے پانی چڑھا"۔

ویاس جی نے بیان کرنا شروع کیا کہ کورو کشیتر میں کیسا رن پڑا کہ خون کی ندیاں بہہ گئیں۔

جنمی جے ہاتھ جوڑ کر بولا" اے میرے بڑوں کے بڑے، میں نے ساری کتھا سنی پر میری بیکلی باقی ہے"۔

"کیا بیکلی ہے تجھے"۔

"مہاراج، مجھے یہ سوال بیکل کر رہا ہے کہ میرے بڑوں کو ہو کیا گیا تھا۔ کیا انہیں پتہ نہیں تھا کہ جنگ میں بربادی ہی بربادی ہے۔ پھر کوروں پر کیا جن سوار ہوا اور پانڈوؤں کے دماغ میں کیا سمائی کہ آپس میں کٹ مرے"۔

ویاس جی نے ٹھنڈا سانس بھرا" آدمی مورکھ ہے"۔

"پر مہاراج وہاں تو بڑے بڑے گنی گیانی موجود تھے، پانڈوؤں میں بھی اور کوروؤں میں بھی۔

"اوشیہ تھے۔ پر میرے بیٹے جب بُری گھڑی آتی ہے تو بدھی والوں کی بدھی بھرشٹ ہو جاتی ہے"۔

"مہاراج بدھی والوں کی بدھی کیسے بھرشٹ ہو جاتی ہے"۔

"بس آنکھوں پر پردے پڑ جاتے ہیں اور مت ماری جاتی ہے اور ہونی ہو کر رہتی ہے۔ جیسے تیری آنکھوں پر پردے پڑ جائیں گے اور مت ماری جائے گی اور ہونی ہو کر رہے گی"۔

جنمی جے چونک پڑا" اے گنی گیانی، میری آنکھوں پر کیسے پردے پڑ جائیں گے اور کیسے مت ماری جائے گی"۔

"میرے بیٹے، نہ پوچھنے کا کوئی فائدہ ہے نہ بتانے کا کوئی فائدہ ہے۔ آدمی مورکھ ہے۔ جو ہونی ہے وہ ہو کر رہتی ہے"۔

"رشی مہاراج، اگر تم مجھے بتا دو گے تو میں چوکنا ہو جاؤں گا۔ پھر ہونی کیسے ہو گی"۔

"لے میں بتائے دیتا ہوں۔ گھوڑوں کا ایک بیوپاری ایک گھوڑا نپٹ سندر لے کر تیرے دربار میں آئے گا تو اس گھوڑے پر لہلوٹ ہو جائے گا۔ بیوپاری کو منھ مانگے دام دے کر گھوڑے کو لے لے گا۔ بس پھر جو ہونا ہے وہ ہو گا"۔

"اچھا ایسا ہے تو میں پوچھتا ہوں کہ مہاراج آپ کا آدیش میرے لئے کیا ہے"۔

"بیٹے میں تو یہی کہتا ہوں کہ اس گھوڑے کو خریدیو ہی مت مفت بھی ملے تو مت لیجئیو۔ مگر تو کہاں مانے گا"۔

جنمی جے نے کہا "رشی مہاراج، یہ کونسی بڑی بات ہے۔ آپ کہتے ہیں تو اسے نہیں خریدوں گا۔" رک کر بولا "پر ایک بات پوچھوں"۔

"پوچھ بچے"۔

"ویسے تو میں وہ گھوڑا خریدوں گا نہیں۔ لیکن اگر میں خرید لوں تو پھر کیا ہو گا"۔

"پھر تیرا اس پہ سوار ہونے کو جی چاہے گا۔ دیکھ میں تجھے خبردار کرتا ہوں کہ اس پہ سوار مت ہونا"۔

"رشی مہاراج، اگر آپ کی آگیا نہیں ہے تو میں اس پر سوار نہیں ہوں گا۔" رک کر بولا "پر میرے دل میں ایک کرید ہے"۔

"وہ کیا ہے"۔

"ویسے تو میں آپ کی آگیا کا پالن کروں گا اور اس گھوڑے پر سوار نہیں ہوں گا۔ لیکن اگر میں اس گھوڑے پر سوار ہو گیا تو پھر کیا ہو گا"۔

"مورکھ، ہو گا، ہو گا یہ کہ وہ گھوڑا بگٹٹ دوڑ پڑے گا۔ پلک مارتے ہوا ہو جائے گا۔ تیرے روکے نہ رُکے گا۔ ایک جنگل بیابان میں لے جا کر تجھے چھوڑ دے گا"۔

"مہاراج، جنگل بیابان میرا کیا بگاڑے گا۔ میں نپٹ ڈراونے بنوں میں گھوما پھرا ہوں۔

کبھی بھوتوں پریتوں راکشسوں سے پالا پڑا‘ کبھی اجگروں سے‘ کبھی شیروں‘ چیتوں سے‘ پر جو بھی میرے سامنے آیا بچ کے نہیں گیا۔

دیاس جی ہنسے "میرے بھولے پتر‘ ان سب بلاؤں سے بڑھ کر ایک بلا ہے"۔

"وہ کون بلا ہے؟"

"ناری۔"

"ناری؟"

"ہاں ناری۔ وہ بڑی بلا ہے ۔ اس کا کاٹا پانی نہیں مانگتا۔ میرا کہا مانے گا تو بچ جائے گا۔ نہیں تو مارا جائے گا۔ پر رونا یہی ہے کہ تو میرا کہا مانے گا نہیں اور ہونی ہو کر رہے گی۔

"مہاراج آپ کا کہا کیوں نہیں مانوں گا"۔

"ارے جب سینگی رکھ جیسے بیٹے نے وبھنڈک جیسے باپ کا کہا نہ مانا اور ہونی ہو کر رہی تو تو میرا کہا کیا مانے گا"۔

"مہاراج‘ وبھنڈک کا کہا کیا تھا کہ سینگی رکھ نے نہیں مانا تھا اور کیا ہونی تھی کہ ہو کر رہی"۔

تب دیاس جی نے جنمی جے کو سینگی رکھ اور وبھنڈک کی کتھا سنائی۔ وبھنڈک رشی کا خیال تھا کہ آدمی کی صحبت آدمی کو خراب کرتی ہے۔ سو انہوں نے ایک نرجن بن میں باس کیا اور وہیں بیٹے کو پالا پوسا ۔ بیٹا سینگی رکھ بھی باپ کی طرح بڑا تپسوی تھا۔ آدمیوں کی دنیا سے دور‘ نرناری کی صورت سے بیگانہ اپنی تپ میں مگن رہتا تھا۔ پر ایک دفعہ ایسا ہوا کہ انگ دیس میں سوکھا پڑ گئی ۔ کھڑی کھیتیاں جل گئیں۔ اناج کے نام دانہ نہیں اگا۔ راجہ نے برہمنوں کو جمع کیا اور پوچھا کہ مینہ کے نام بوند نہیں پڑی کچھ بتاؤ کہ کیا کیا جائے۔ برہمنوں نے سوچ بچار کر کے کہا کہ ندی پار بن میں سینگی رکھ باس کرتا ہے۔ باپ نے اسے بستی میں آنے سے منع کر رکھا ہے۔ اگر کسی طور بہلا پھسلا کر اسے بستی میں کوئی لے آئے تو برکھا ہو گی اور سارے دلدر دور ہو جائیں گے۔

راجہ نے سوچ بچار کر کے ایک چاتر کنچنی کو بلایا اور آدیش دیا کہ سینگی رکھ کو بہلاوا دے کے کسی طرح انگ دیس میں لے آ۔ اس کنچنی نے اپنی ناؤ بنوائی۔ اس میں بیٹھ کر ندی کے پار گئی اور ایسے سے سینگی رکھ کے پاس پہنچی جب وبھندر کہیں دور جنگل میں ایندھن اکٹھا کرنے گیا ہوا تھا۔ سینگی رکھ اسے دیکھ بھوچک رہ گیا۔ ناری کو اس نے کب دیکھا تھا اسے پتہ ہی نہیں تھا کہ ناری کیسی ہوتی ہے۔ پوچھا "تم کون ہو۔ تمہارا آشرم کہاں ہے۔ یہاں کیسے آنا ہوا۔" وہ بولی "تمہاری داسی ہوں۔ میرا آشرم ندی کے اس طرف ہے۔ تمہارے لئے پھول مالا اور پھل لے کر آئی ہوں۔" کہہ کے اس نے اس کے گلے میں پھول مالا ڈالی۔ میٹھے میٹھے پھل جو لے کر آئی تھی کھلائے۔ پھر چلنے کے لئے تیار ہوئی۔ چلتے ہوئے بولی کہ "اب میں چلتی ہوں۔ پردیسیوں کی جو ریت ہے اسے پوری کرنے کی آگیا دو"۔ سینگی رکھ نے کہا کہ "آگیا دی"۔ کنچنی نے آگے بڑھ کر سینگی رکھ کے گلے میں باہیں ڈالیں سینے سے سینہ ملایا اور ہونٹوں پر ہونٹ رکھ دیئے سینگی رکھ کچھ نہ سمجھا کہ یہ کیا ہوا۔ پر اسے یہ سب کچھ بہت اچھا لگا۔ کنچنی چلی گئی اور وہ اسی طرح بے سدھ کھڑا رہا۔

وبھندک رشی واپس آیا تو بیٹے کے طور دیکھ کر چکرایا۔ کہا "پتر' میں دیکھتا ہوں کہ تیرا طور بے طور ہے۔ گلے میں پھول مالا پڑی ہے۔ یہ پھول مالا کہاں سے آئی۔ اور پھلوں کے چھلکے یہاں کیسے پڑے ہیں۔

سینگی رکھ نے جھرجھری لی۔ کہا کہ "باپ' ایک جنا آیا تھا۔ ایسا سندر کہ میں تو دیکھ کر موہت ہو گیا"۔

"کون تھا وہ جنا"۔

"کوئی ودیارتھی تھا"۔

"کیسا تھا وہ ودیارتھی"۔

"کیا بتاؤں کیسا تھا۔ بال گھٹا سے' گال گلابی' نین متوالے' ہونٹ رسیلے' سینہ جیسے دو پھول پھولے ہوں۔ ہر پھول پر ایک بھونرا بیٹھا ہو۔ پیٹ چندن کی تختی' کمر پتلی' کولھے بھاری بس باپ اس سے آگے کی مت پوچھ"۔

وبھندر نے ماتھا پیٹا "مورکھ تو اسے ودیارتھی کہتا ہے۔ وہ تو ناری تھی"۔

"ناری؟" سینگی رکھ چکرایا "ناری ایسی ہوتی ہے"۔

"ہاں میرے نادان بیٹے وہ ایسی ہی ہوتی ہے۔ وہ یاں پہ کیسے آ گئی"۔

"رام جانے کیسے آئی۔ بس آ گئی"۔

"یہ تو بہت برا ہوا۔ اچھا بتا اس نے تیرے پاس آکر کیا کیا"۔

"وہ مجھے دیکھ کر مسکائی۔ میرے گلے میں پھول مالا ڈالی۔ مجھے پھل کھلائے۔ پھر میرے گلے میں بانہیں ڈالیں۔ سینے سے سینہ ملایا اور ہونٹوں پہ ہونٹ رکھے"۔

"اور؟" وبھندر نے سخت پریشان ہو کر پوچھا۔

"بس"۔

وبھندر نے ایک شک کے ساتھ بیٹے کو سر سے پیر تک دیکھا "اور کچھ نہیں ہوا"؟

"نہیں"

وبھندر سوچ میں پڑ گیا۔ پھر بولا "ویسے تو بہت برا ہوا۔ پر خیر ہوئی کہ تو بھوگ بلاس سے بچ گیا"۔

"بھوگ بلاس؟ باپ وہ کیا چیز ہوتی ہے"۔

"بیٹے اسے نہ جاننے ہی میں تیرا بھلا ہے۔" پھر سوچ کر کہا "دیکھ اب وہ آجائے تو اس سے بات مت کیجیو"۔

"بیٹے نے باپ کے آدیش کو گرہ میں باندھ لیا۔ سو جب اگلے دن وہ آئی تو اس نے صاف کہہ دیا کہ تو تو ناری ہے۔ میں تجھ سے بات نہیں کروں گا۔ تو واپس چلی جا"۔

"اچھا یہ بات ہے۔ میرے بھگوان کی اچھّا یہ ہے کہ میں چلی جاؤں تو لے میں جاتی ہوں"۔

یہ کہہ کر وہ ایسے اٹھلا کر چلی کہ سینگی رکھ تلملا گیا۔ اس نے پکارا "او ناری' ذرا رک"۔

وہ رک گئی۔

"ایک بات بتاتی جا"۔

"کیا"

"بھوگ بلاس کیا ہوتا ہے"۔

کنچنی نے مسکرا کے اسے دیکھا اور بولی "یاں پہ نہیں بتاؤں گی۔"

"پھر کہاں بتائے گی"۔

"میرے ساتھ چل ندی کے پار جا کے بتاؤں گی۔"

سینگی رکھ کو تو چینک لگی ہوئی تھی کہ یہ بھوگ بلاس کیا چیز ہوتی ہے۔ اسی چینک میں وہ اس کے ساتھ ہو لیا۔ وہ اسے ناؤ میں بٹھا کر ندی کے اس پار لے گئی اور جب ندی کے پار اتر کر اس نے انگ دیس میں قدم رکھا تو چھم چھم مینھ برسنے لگا۔ راجہ بہت خوش ہوا۔ اس نے آدمیوں کو دوڑایا کہ سینگی رکھ کے گلے میں پھول مالا ڈالو اور آدر کے ساتھ میرے پاس لاؤ۔ میں راجکماری کے ساتھ اس کا بیاہ کروں گا اور دربار میں اونچے استھان پہ بٹھاؤں گا۔

راجہ کے آدمی دوڑے ہوئے گئے۔ سینگی رکھ کے گلے میں پھول مالا ڈالی اور ہاتھی پر بٹھا کر اسے راج دربار کی طرف لے کے چلے۔ سینگی رکھ نے کنچنی کی طرف دیکھا اور کہا کہ "میں جس بات کے لئے آیا تھا وہ تو رہ ہی گئی۔ تو نے مجھے بھوگ بلاس کا مطلب نہیں بتایا۔ یاں پہ آئے تو چکر دوسرا ہی چل گیا"۔

کنچنی نے قہقہہ لگایا اور کہا "اب بھوگ بلاس کا مطلب تجھے راجکماری سمجھائے گی"۔

راجکماری نے تو اسے وہ بھاؤ بتائے کہ پھر نہ اسے اپنی تپ یاد رہی نہ باپ کا خیال آیا۔ راجکماری کا ہو رہا اور رنگ رس میں ڈوب گیا۔

یہ کہانی سنا کر ویاس جی یوں بولے "ناری اس طرح آدمی کو اس کے رستے سے بھٹکاتی ہے۔ دیکھ جنمی جے، تجھے بھی اس بن میں ایک ناری ملے گی۔ میرے کہے کو پلے باندھ لے۔ اس ناری سے بات مت کیجیو۔ مگر تو کہاں مانے گا۔ اس سے بات کرے گا۔ اور ہونی ہو کر رہے گی"۔

جنمی جے نے کہا" رشی مہاراج ' آپ کی بات میں نے پلے باندھ لی۔ اس ناری کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھوں گا ' بات کرنا تو بعد کی بات ہے۔ پر ایک بات پوچھوں"۔

"پوچھ"

"اگر میں نے اس سے بات کر لی تو کونسی ہونی ہے جو ہو کر رہے گی"۔

"مورکھ ناری انگلی پکڑتے پکڑتے پہنچا پکڑتی ہے۔ تو اس سے بات کرے گا اور تو اسی پہ بس نہیں کرے گا۔ پھر اسے اپنے راج محل میں لے جانے کی سوچے گا۔ جنمی جے اسے راج محل میں لیجا کے مت رکھیو۔ پر تو کہاں مانے گا۔ ہونی تو ہو کر رہے گی۔

"رشی مہاراج ' آپ کا کہا سر آنکھوں پر۔ اس ناری کو راج محل لے جا کے نہیں رکھوں گا۔ پر مجھے آپ کے اس کہنے کہ ہونی ہو کر رہے گی چنتا میں ڈال دیا ہے۔ تو میں یہ پوچھوں ہوں کہ اگر میں اس ناری کو راج محل میں لے گیا تو کیا ہو جائے گا"۔

"پوچھتا ہے کیا ہو جائے گا۔ ارے غضب ہو جائے گا ۔ تیرے ہاتھوں سے اتنی بڑی ہنسا ہو گی کہ لوگ کورو کشیتر کی ہنسا کو بھول جائیں گے۔" ویاس جی یہ کہتے کہتے الوپ ہو گئے۔

جنمی جے حیران ہوا کہ ویاس جی کہاں گئے۔ آدمیوں کو دور دور تک دوڑایا۔ پر ویاس جی کا اتا پتا نہ ملا۔

جنمی جے نے اپنے آپ کو بہت بھاگوان جانا کہ ویاس جی نے اسے درشن دیئے۔ اس درشن کو اس نے بہت دنوں تک یاد رکھا۔ مگر پھر راج کاج کے چکروں میں بات آئی گئی ہو گئی اور ویاس جی نے جو باتیں کہی تھیں وہ تو بالکل ہی بسر گئیں۔

ایک دن گھوڑوں کا ایک بیوپاری راج دربار میں آیا۔ اس کے پاس ایک ہی گھوڑا تھا پر کیا شان والا تھا۔ اونچا قد ' سفید رنگت ' چمکتی جلد جیسے دھوپ کا ٹکڑا ہو۔ ایال مانو پری کے بال بدن چست جیسے جلد کی تہہ میں پارہ بھرا ہو ۔ جنمی جے اس پر ایسا ریجھا کہ منہ مانگے دام ادا کیے اور ترت ہی اس پہ سوار ہو گیا۔ گھوڑا پہلے ہی بیتاب ہو رہا تھا۔

رانوں کے بیچ آیا تو تڑپ کر اس طرح دوڑا کہ دم کے دم میں کہیں سے کہیں پہنچا - بستی کی راہوں کو روندتا جنگل میں جانکلا - گھنے بنوں میں اجنبی اَن دیکھے راستوں پر دوڑا چلا جا رہا تھا- جنمی جَجے نے بہت باگ کھینچی پر گھوڑا رکنے کا نام نہ لیتا تھا- دیر بعد خود ہی ایک جنگل بیابان میں پہنچ کر ایک گھنے پیڑ کی چھاؤں تلے ٹھٹھک گیا- جنمی ججے کا سانس میں سانس آیا- فوراً ہی اتر پڑا - مگر کیا دیکھتا ہے کہ اس چھاؤں میں ایک سندر ناری سولہ سنگھار کیئے بیٹھی ہے- راجہ بھوچک رہ گیا- اسی دم اسے ویاس جی کی بات یاد آئی- دل ہی دل میں اپنے آپ پہ لعنت کی کہ مورکھ گورو کی آگیا کو بھولا اور گھوڑے پر سوار ہو گیا- پھر دل میں فیصلہ کیا کہ اب تک جو ہوا سو ہوا پر اب میں ویاس جی کے آدیش کا پورا پورا پالن کروں گا- سو جب اس ناری نے اسے مسکرا کر دیکھا تو اس نے اپنے مچلتے دل کو سنبھالا اور جی کڑا کر کے کہا کہ اے سندر ناری ' میں اپنے گورو کے حکم سے مجبور ہوں- سو میں نہ تجھ سے ہنسوں بولوں گا نہ یہ پوچھوں گا کہ اس نرجن بن میں کس کارن براجنا ہوا"-

سندر ناری نے یہ سن اسے تیز نظروں سے دیکھا اور پوچھا" میں بھی تو سنوں کہ وہ کون گورو ہے جس نے تجھے مجھ سے بات کرنے سے منع کیا ہے"-

"وہ ہمارے مہان گورو ویاس رشی ہیں"-

اس پر اس نے زہر بھرا قہقہہ لگایا-

"اے سندر ناری کیا تو ویاس رشی کو نہیں جانتی جو اس طرح ہنسی ہے"-

"جانتی ہوں- خوب جانتی ہوں-"

"پھر کیا تجھے اس مہان آتما کے گیان میں شک ہے"-

"رشی مہاراج کے گیان میں مجھے کوئی شک نہیں ہے- پر اس گیانی کو ناری گیان کتنا ہے"-

"یہ تو کیا کہہ رہی ہے"-

"صحیح کہہ رہی ہوں- گیانی ہونا اور بات ہے - ناری کو جاننا اور بات ہے- اس رشی کو ناری کا کیا پتہ- ستیاوتی نے اسے ایک رات کے لئے اپنی دو رانڈ بہوؤں سے بھڑا دیا تھا-

سو جو کچھ ہوا وہ سب کو پتہ ہے ۔ ایک نے اس بوڑھے کھوسٹ کی لمبی الجھی جٹائیں دیکھ کر ڈر سے آنکھیں بند کر لیں۔ دوسری اسے دیکھ کر پیلی پھدق پڑ گئی۔ سو ایک نے اندھا بیٹا جنا۔ دوسری کے پیٹ سے پیلا ہلدی بالک پیدا ہوا"۔

یہ سن کر جنمی جئے سوچ میں پڑ گیا۔ دل میں کہا کہ ناری کہتی تو ٹھیک ہے ویاس جی ویسے تو جگت گیانی ہیں۔ ویدوں پرانوں میں پیرے ہوئے۔ پر ان کا ناری کا خانہ تو خالی ہے سندر ناری نے بھانپ لیا کہ تیر نشانے پر لگا۔ اب وہ ڈانواڈول ہے ۔ چندرا کر بولی کہ مورکھ مجھے تیرا کیا میٹھا ہے ۔ میں نے تو یہ سوچا تھا کہ چلو اس سونے بن میں ایک سے دو ہوئے ۔ کوئی بھلا مانس ہے۔ دو باتیں ہوں گی تو دل بہلے گا۔ پر تو تو بن مانس نکلا آتے ہی مانس گند مانس گندا لاپنا شروع کر دیا۔ تو لے میں چلی۔" اور تاؤ کھا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

اس سندر ناری کی یہ ادا دیکھ کر جنمی جئے تڑپ اٹھا۔ چلنے لگی تھی کہ اس نے بڑھ کر اس کا ہاتھ تھام لیا" اے سندری اتنی کٹھور مت بن ۔ تو جائے گی تو ساتھ میں ایک جان بھی جائے گی۔ کیوں ایک جیو کی ہتیا کا پاپ اپنے سر لیتی ہے"۔

"چھوڑ میری کلائی۔ میں ایسی اڑن گھائیوں میں آنے والی نہیں ہوں۔"

غصے سے وہ لال بھبوکا ہو رہی تھی ۔ تیوری پہ کتنے بل آئے کتنے بل گئے۔ مگر جنمی جئے کی پکڑ کے بیچ وہ موم ہوتی چلی گئی۔ آخر کو بالکل ہی پگھل گئی ۔ ایسے پگھلی جیسے گرم انگلیوں میں گھی پگھلتا ہے۔ ادھر جنمی جئے بھی پگھلتا گھلتا چلا گیا۔ ایسے ملے کہ جیسے ایک دوسرے میں گھل جائیں گے۔

بھرپور ملے۔ مگر چاہت میں ذرا جو کمی آئی ہو۔ بلکہ بیکلی اور بڑھ گئی ۔ جنمی جئے نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اسے کولی میں بھر کر اٹھا گھوڑے پر بٹھایا اور ایڑ لگائی۔ گھوڑا دم کے دم میں ہوا سے باتیں کرنے لگا۔ جس طرح فراٹے بھرتا آیا تھا اسی طرح فراٹے بھرتا واپس چلا۔ پھر وہ راج محل کے پھاٹک پر جا کر ہی رکا۔

سندر ناری جنگل سے نکلی، راج محل میں براجی ، ہستناپور میں راج رچنے لگی۔ جنمی جئے اس کے پاؤں دھو دھو پیتا تھا۔ اور اس کا نمسا ایسا کہ ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتی تھی۔

ایسا ہوا کہ جنمی جے نے پنڈتوں ودھوانوں کی سبھا بلائی۔ اس میں یہ نئی نویلی رانی بھی براجی۔ پنڈتوں ودھوانوں نے اسے دیکھا تو دیکھتے ہی رہ گئے۔ ایسا سندر مکھڑا ' ایسی چھب انہوں نے کب دیکھی تھی۔ بس سندری کی تیوری چڑھ گئی۔ ترنت اٹھ کھڑی ہوئی اور کمر اور چوٹی کا عالم دکھاتی اندر لوٹ گئی۔ یہ دیکھ جنمی جے کا ماتھا ٹھنکا پیچھے پیچھے اندر گیا۔

سبھا کے بیچ میں سے اچانک اُٹھ آنے کا کارن پوچھا تو لال پیلی ہو کر بولی کہ پنڈتوں نے مجھے بری نظروں سے دیکھا ہے۔

راجہ نے یہ سنا تو آگ بگولا ہو گیا۔ ان پنڈتوں کی یہ مجال کہ میری رانی کو بری نظروں سے دیکھیں۔ ادھر سندری نے کہہ دیا کہ راج نگر میں اب یہ پنڈت رہیں گے یا میں رہوں گی۔ اس اعلان نے جلتی پہ تیل کا کام کیا۔ راجہ کے سر پر خون سوار ہو گیا۔ فوراً پلٹا اور سنگھاسن پر بیٹھ کے ان سب پنڈتوں کی گردنیں اتارنے کا حکم دے ڈالا۔

جب پنڈتوں کی گردنیں اتر گئیں تو اس کا کلیجہ ٹھنڈا ہوا۔ سوچا کہ اندر راج محل میں جاکر اپنی رانی کو بتاؤں کہ تمہارا اپمان کرنے والوں کی گردنیں اتر گئیں کہ اس کا کلیجہ بھی ٹھنڈا ہو جائے۔ یہ سوچ کر سنگھاسن سے اٹھنے لگا تھا کہ اچانک جانے کہاں سے ویاس جی آن وارد ہوئے۔

جنمی جے نے اٹھ کر ویاس جی کا سواگت کیا۔ انہیں سنگھاسن پر بٹھایا۔ چاندی کا لگن اور گلاب کیوڑے کا پانی منگا کر ان کے پیر دھونے لگا تھا کہ ویاس جی نے ٹوکا۔

"پتر' تیرے ہاتھ گندے ہیں"۔

یہ سن کر جنمی جے سٹپٹایا۔ بولا" اچھا میں ہاتھ دھو کر پاک کیے لیتا ہوں"۔

ویاس جی نے اسے دیکھا ' اس کے ہاتھوں کو غور سے دیکھا۔ پھر غصے سے بولے "مورکھ تیرے ہاتھ تو خون میں سنے ہوئے ہیں۔ اب تو گنگا جمنا کا سارا پانی بھی ان پر انڈیل دیا جائے تو وہ پوتر نہیں ہوں گے"۔

جنمی جے سناٹے میں آگیا۔

پھر ویاس جی آپ ہی آپ اداس ہو گئے۔ دکھی ہوئی آواز میں بولے" آدمی نرالا جانور

ہے۔ بدھی رکھتا ہے ۔ بدھی کو کام میں نہیں لاتا ۔ سمجھاؤ تو سمجھتا نہیں ۔ منع کرو تو مانتا نہیں۔ سوہونی ہو کر رہتی ہے"۔

پھر بجھے دل کے ساتھ اٹھے اور بنوں کی طرف نکل گئے۔

❁ = = = = = = = ❁

تعلق

صبح ہی صبح ادہر اخبار والے نے اخبار پھینکا ادہر خواجہ صاحب نے دروازہ کھٹکھٹایا۔

"کرامت میاں اخبار آگیا....؟"

"جی آگیا ہے - آیئے تشریف رکھیے"

یہ میرے ناشتہ کرنے اور دفتر جانے کا وقت ہوتا تھا

ہمارا ڈرائنگ اور ڈائننگ کمبائنڈ ہے ادہر میں بیگم کے ساتھ ملکر ناشتہ کر رہا ہوں ادہر ڈرائنگ روم میں خواجہ صاحب اخبار پڑھنے میں غرق ہیں۔

"خواجہ صاحب آیئے ناشتہ کیجئے"۔

"بیٹے بسم اللہ کرو"۔

"ناشتہ نہیں کرتے تو چائے ہی پی لیجئے"۔

"نہیں بیٹے میں تو بس اخبار پر ایک نظر ڈالنے کے لئے آیا ہوں"۔

"وہ ٹھیک ہے مگر ساتھ میں چائے بھی ہو جائے تو کیا مضائقہ ہے۔ کوئی غیریت تو نہیں ہے"۔

"بیٹے میں اس گھر میں خدا غریق رحمت کرے سید صاحب کے وقت سے آرہا ہوں اب تم ان کی نشانی ہو بھلا تم سے غیریت برتوں گا۔۔۔۔۔۔"

بجا کہا۔ اصل میں تو والد صاحب سے ان کی دوستی تھی جاڑے، گرمی، برسات روز

صبح کو دروازہ کھٹکھٹانا ان کے پاس بیٹھ کر اخبار پڑھنا' باتیں کرنا اور چلا جانا۔

مگر انتقال کے بعد بھی انہوں نے وضعداری قائم رکھی۔ اسی طرح صبح کو آکر اخبار پڑھنا اور چلے جانا باقی کسی بات سے مطلب نہیں۔ کبھی اکا دکا بات بھی کی تو اخبار ہی کے حوالے سے .....

"کرامت میاں' اخباروں کو کیا ہو گیا ہے" ....

"کیا ہوا خواجہ صاحب؟"

"آج تو کوئی خبر ہی نہیں ہے"

"خواجہ صاحب' خبر کوئی آئے گی تب اخبار میں شائع ہو گی آج کوئی بڑی خبر ان کے پاس نہیں ہو گی"۔

"کیسی باتیں کرتے ہو کرامت میاں۔ اتنی بڑی دنیا اتنی بہت سی خلقت اور دنیا میں کیا کچھ نہیں ہو رہا جو کبھی نہ ہوا تھا وہ اب ہو رہا ہے اور ہمارے اخباروں کے پاس دینے کے لئے خبر نہیں ہے ......"

یہ کہتے کہتے اٹھ کھڑے ہوئے۔

"جا رہے ہیں آپ .....؟"

"ہاں بھئی چل کر گھر کو دیکھتے ہیں آج تو میں مسجد سے نکل کر سیدھا اسی طرف آگیا سوچا کہ گھر بعد میں پہلے کرامت میاں کے یہاں چل کر اخبار پر ایک نظر ڈال لیں۔ مگر اخبار میں کوئی خبر ہی نہیں تھی ---------"

ان کے جانے کے بعد بیگم نے کتنا لمبا اطمینان کا سانس لیا" شکر ہے خدا کا آج تو ایسے جم کے بیٹھے تھے کہ ٹلنے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے اور اخبار میں بقول ان کے آج کوئی خبر ہی نہیں تھی۔ خبر نہ ہونے پر تو اتنا جم کے بیٹھے خبر ہوتی تو بس یہیں ڈیرا ڈال لیتے"۔

"بیگم کیوں خون جلا رہی ہو اپنا ناشتہ کرو ---------"

"خون تو جلنا ہی ہے یہ تمہارے خواجہ صاحب مجھے زہر لگتے ہیں روز صبح آن دھمکتے

ہیں میں کہتی ہوں کہ اخبار پڑھنے کا ایسا ہی شوق ہے تو اخبار خریدیں ہمارے سینے پر کیوں مونگ دلتے ہیں --------"

"اصل میں خواجہ صاحب ابا جان کے وقت کی وضعداری کو نباہ رہے ہیں ------"

"یہ اچھی وضعداری ہے اس بہانے وہ اخبار کا خرچ بچا لیتے ہیں ---------"

مگر آخر سال میں گنے چنے ایسے دن بھی تو آتے ہیں جب اخبار چھٹی کرتے ہیں وہ ۲۶ دسمبر کی صبح تھی ناشتہ کرتے کرتے مجھے خواجہ صاحب یاد آ گئے۔

"آج خواجہ صاحب نہیں آئے"

"آج اخبار جو نہیں آیا ہے۔"

"ہاں آج تو اخبار کی چھٹی ہے"

"اچھا ہی ہے میں تو کہتی ہوں روز ہی اخبار کی چھٹی ہوا کرے"۔

"بیگم تمہارا بس چلے تو تم پورے پریس کی چھٹی کرادو خواجہ صاحب کی ضد میں صحافت کی تو دشمن مت بن جاؤ ---------"

"صحافت" بیگم نے کتنے تحقیر بھرے لہجہ میں کہا۔ "یہ کمبخت نیا نشہ نکلا ہے اب یہ تمہارے خواجہ صاحب ہیں انہیں افیون کی لت نہ پڑی اخبار کی لت پڑ گئی بات تو ایک ہی ہے ----------"

"نشہ کیا بس ایک عادت ہوتی ہے صبح اور اخبار لازم ملزوم بن کر رہ گئے ہیں جس صبح اخبار نہ آئے وہ صبح خالی خالی سی لگتی ہے - شریف آدمی کی سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کیا جائے -----------"

"آخر پچھلے زمانے میں بھی تو صبح ہوا کرتی تھی"۔

"پچھلے زمانے کا اپنا طور تھا۔ صبح کو لوگ باغوں میں جاکر سیر کرتے تھے۔ اکھاڑوں میں زور کرتے تھے اس کے بعد ڈٹ کر ناشتہ - حلوہ پوری - نہاری - سری پائے۔ لسی کا گلاس وہ سب اب کہاں - اب تو دو ورق کا اخبار اور چائے کے ساتھ دو توس اب صبحوں میں یہی کچھ رہ گیا ہے"۔

میں ابھی یہ کہہ رہا تھا کہ دروازے کی گھنٹی بجی "الہ دین دیکھ کون ہے دروازے پر"

الہ دین کچن سے تیزی سے نکل کر دروازے پر گیا تیزی سے واپس آیا "خواجہ صاحب ہیں جی"

"پھر آگئے" بیگم کا موڈ پھر خراب ہو گیا۔ "یہ ہمارا پیچھا نہیں چھوڑیں گے"۔

"بلالو اندر"۔

"کیوں بلالو۔ آج کونسا اخبار ان کی جان کے لئے رو رہا ہے"۔

"بیگم مروت بھی کوئی چیز ہوتی ہے اب اگر خواجہ صاحب آجاتے ہیں تو ان سے کہا جائے کہ آپ چلے جایئے۔"

"تمہاری جگہ میں ہوتی تو صاف صاف کہہ دیتی ذرا لگی لپٹی نہ رکھتی"۔

اتنے میں خواجہ صاحب آن داخل ہوئے۔ بیگم کو اپنا بیان بیچ میں روکنا پڑا۔

"آیئے خواجہ صاحب تشریف رکھئے مگر اخبار تو آج آیا نہیں ہے"

"ہاں بھئی کل چھٹی تھی آج تو اخبار آنا ہی نہیں تھا مگر مجھے خیال آیا کہ بھئی چل کے کل ہی کا اخبار دیکھ لیں"۔

"کل آپ نے اخبار نہیں دیکھا تھا"۔

"دیکھا تھا بیٹا۔ مگر کیا پوچھتے ہو ہمارا حافظہ جواب دے گیا ہے گھنٹے بھر پہلے کی کہی بات یاد نہیں رہتی ایک دن پہلے پڑھا اخبار کہاں یاد رہتا ہے"۔

"الہ دین کل کا اخبار لاؤ"

میری آواز پر الہ دین کچن سے نکل آیا کل کے اخبار کے مطالبے پر سٹپٹایا "کل کا اخبار....؟"

"ہاں کل کا اخبار۔کیوں کیا بات ہے"

اس موقع پر بیگم الہ دین کے آڑے آئیں "کل کا اخبار تو استعمال میں آگیا ہے۔ میں نے ہی الہ دین سے کہہ دیا تھا کہ الماری کے خانوں میں بچھانے کے لئے اور کاغذ کہاں سے لاؤں۔ آج کا اخبار پڑا ہے اب اس کی کیا ضرورت پیش آئے گی اسے ہی بچھالو......"

خیر کوئی بات نہیں خواجہ صاحب نے فوراً مسئلہ کا حل پیش کیا "پرسوں کا اخبار تو ہو گا اس میں مضمون بہت کام کا شائع ہوا ہے اسے لے آؤ دوبارہ وہ مضمون پڑھ لیں گے۔۔۔۔۔"

الہ دین اندر گیا ٹٹول کر دو دن پہلے کا اخبار لایا۔ خواجہ صاحب خوش ہو گئے۔

ایسا وضعدار ایسا وقت کا پابند آدمی اگر ایک دن نہ آئے اور پھر دوسرے دن بھی نہ آئے تو تجسّس ہوتا ہے کہ آخر کیوں نہیں آیا۔ مگر مجھے بعد میں بیگم کو پہلے کرید ہوئی .....

"کیا بات ہے کل سے تمہارے خواجہ صاحب نہیں آ رہے".......

"چلو اچھا ہے تم بہت بور ہوتی تھیں"۔

"ہاں کسی طرح ٹل جائیں تو اچھا ہی ہے جتنی دیر بیٹھے رہتے ہیں میرا خون جلتا رہتا ہے"۔

"بیچارے خواجہ صاحب"

"بیچارے وچارے وہ کوئی نہیں ہیں گانٹھ کے بہت پکے ہیں۔ دانت سے پیسے پکڑتے ہیں۔ اخبار پڑھنے کا تو بڑا شوق ہے ۔ مگر اخبار خریدنے سے جان جاتی ہے ایک ہم بے وقوف انہیں مل گئے ہیں صبح ہوئی اور آن دھمکے ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔"

"مگر تم ان کے اصول کی داد نہیں دیتیں۔ اخبار پڑھنے کے لئے آتے ہیں تو صرف اخبار ہی پڑھتے ہیں اور کوئی بات نہیں کرتے"۔

"ایسے اصول والے ہیں تو خود اخبار کیوں نہیں خریدتے ہیں"

"بس ہمارے گھر آ کر اخبار پڑھنے کی عادت جو ہوئی"۔

یا شاید اس طرح وہ ابا جان کی یاد کو اپنے اندر تازہ رکھتے ہیں۔

مگر دو دن سے کیوں نہیں آئے ۔ اب مجھے کرید ہوئی کہیں انہیں یہ احساس تو نہیں ہو گیا کہ اس گھر میں ان کی آمد پسند نہیں کی جاتی۔

"اچھا تو وہ ہم سے بگڑ گئے ہیں"۔

"شاید"

"بگڑتے ہیں تو بگڑ جائیں ۔ آتے تھے تو ہمیں کیا دے جاتے تھے نہیں آئیں گے تو ہم

کونسی نعمت سے محروم ہو جائیں گے"۔

الہ دین نے میز سے ناشتے کے برتن اٹھاتے اٹھاتے خواجہ صاحب کا ذکر سنا اور اطلاع دی "بیگم صاحب جی خواجہ صاحب تو لمبے پڑے ہیں"

بیگم گھبرا کر "کیوں۔ کیا ہوا۔ خیر تو ہے......"

"بیگم صاحب جی خواجہ صاحب کا غسل خانے میں پاؤں پھسل گیا بس جی لمبے لیٹ گئے۔ ٹانگ میں بہت چوٹ آئی ہے ---------"

میں بس دفتر جانے کے لئے کھڑا ہو گیا تھا مگر بیگم نے مجھے صورت حال کی سنگینی کا احساس دلایا۔

"سن رہے ہو الہ دین کیا کہہ رہا ہے۔ بڑھاپے کی چوٹ ہے اللہ خیر کرے"۔

"بہت برا ہوا میں بھی سوچ رہا تھا کہ آخر خواجہ صاحب آئے کیوں نہیں۔ وہ تو اپنے وقت کے بڑے پابند تھے ان کی نماز قضا ہو سکتی تھی یہاں آنا اور اخبار پڑھنا قضا نہیں ہو سکتا تھا۔----------"

مگر بیگم زبانی کلامی ہمدردی پر قانع نہیں ہوئی۔ تقاضا کیا کہ خواجہ صاحب کو دیکھنے چلو۔

"مگر دفتر کا وقت ہے ادھر گیا تو دفتر کو دیر ہو جائے گی ----------"

"کیسی باتیں کر رہے ہو آدمی سے بڑھ کر تو دفتر نہیں ہے۔ ایک دن دفتر نہ جاؤ گے تو کیا قیامت آجائے گی"۔

بیگم کے اس ردعمل نے میرے اندر ایک احساس جرم پیدا کر دیا کہ میں کتنا بے حس ہوں اور بیگم جو یوں خواجہ صاحب سے بیزار رہتی ہے کتنی دردمند خاتون ہے تو دفتر کا خیال چھوڑ کر میں نے خواجہ صاحب کی عیادت کے لئے جانے کی ٹھانی۔

خواجہ صاحب مجھے اور بیگم کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے

"خواجہ صاحب یہ کیا کر لیا آپ نے"۔

"بس بیٹا کیا بتائیں۔ غسل خانہ گیلا تھا پاؤں پھسل گیا"۔

"کیا چوٹ زیادہ آئی ہے"۔

"تکلیف بہت زیادہ ہے بس اللہ نے اتنا رحم کیا کہ ہڈی سلامت رہی"۔

بیگم نے ٹکڑا لگایا" اس کے لئے تو شکرانے کی نماز پڑھنی چاہیے بڑھاپے کی ہڈی مشکل ہی سے جڑتی ہے"

"ہاں پھر تو ہم چلنے پھرنے ہی سے رہ جاتے"

میں نے پوچھا اب ڈاکٹر کیا کہتا ہے۔

"کہتا ہے آرام کرو میں نے کہا ڈاکٹر صاحب اتنا چلنے پھرنے کے قابل بنا دیجئے کہ کرامت میاں کے یہاں جا کے اخبار پر ایک نظر ڈال لیا کروں"۔

"اجی اخبار کا کیا ہے" بیگم نے کہا "وہ تو میں ابھی الہ دین کے ہاتھ بھجوا دوں گی"۔

"نہیں بیٹی"

میں نے کہا خواجہ صاحب اس میں کیا ہرج ہے اخبار روز صبح الہ دین کے ہاتھ بھجوا دیا کریں گے۔

"نہیں بیٹے۔ ہم نے زندگی میں پلنگ پر لیٹ کے کبھی اخبار نہیں پڑھا"۔

خواجہ صاحب کی بیٹی رشیدہ بولی" میں نے اخبار کل بھی منگایا تھا۔ آج بھی منگا لیا ہے مگر ابا جی نے اسے ہاتھ بھی نہیں لگایا"۔

بس اس روز سے بیگم نے روز کا یہ معمول بنا لیا کہ ناشتہ سے فراغت پا کر ادھر میں دفتر کی طرف روانہ ہوا ادھر بیگم اخبار بغل میں داب خواجہ صاحب کی طرف۔ خواجہ صاحب اخبار تو نہیں پڑھتے تھے مگر اس بہانے بیگم خواجہ صاحب کی خیریت تو معلوم کر لیتی تھی۔

"بیگم کیا حال ہے اب خواجہ صاحب کا"۔

"اب تو اٹھنے بیٹھنے لگے ہیں۔ بلکہ کل تو سہارے سے چل کر برآمدے تک آئے"۔

"بہت جلد Recover کر لیا ------------"

"ہاں اللہ نے رحم کیا۔ میں تو ڈر گئی تھی بڑھاپے میں ایک دفعہ کمر چارپائی سے لگ جائے پھر آدمی مشکل ہی سے اٹھتا ہے تم نے تو اس دن کے بعد جا کر وہاں جھانکا ہی

نہیں ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔"

"کیا بتاؤں دفتر نے آج کل مجھے اتنا الجھا رکھا ہے وقت ہی نہیں ملا بہر حال تم نے تو ان کی بہت عیادت کی"۔

"میں تو دن میں جب تک ایک مرتبہ جا کے خیریت معلوم نہ کر لوں چین نہیں آتا تمہاری طرح میرا خون سفید تو نہیں ہوا ہے"

بیگم کے اس طعنے سے مجھ پر تو گھڑوں پانی پڑ گیا۔ ابھی میں سوچ ہی رہا تھا کہ کیا جواب دوں کہ دروازے کی گھنٹی بجی الہ دین تیزی سے کچن سے نکل دروازے پر گیا اور واپس آکر مژدہ سنایا" خواجہ صاحب آئے ہیں جی"

خواجہ صاحب .....؟......... اچھا ....؟ ہم دونوں ہی حیران رہ گئے۔

خواجہ صاحب چھڑی ٹیکتے ہوئے آہستہ آہستہ داخل ہوئے میں نے بڑھ کر انہیں سہارا دیا سہارا دے کر صوفے پر بٹھایا۔

"لاؤ بیٹے' آج کا اخبار دکھاؤ ' آنکھیں اخبار کے لئے ترس گئیں۔"

میں نے اخبار خواجہ صاحب کے حوالے کیا۔ خواجہ صاحب نے آج کتنی بے تابی سے اخبار سنبھالا جیسے بھوکا آدمی کھانا دیکھ کر ٹوٹ پڑے۔

بیگم نے آکر مزاج پرسی کی" اب آپ کی تبعیت کیسی ہے"

"بہت بہتر ہے دیکھو چل کر یہاں تک آگیا ہوں"۔

"ابھی آپ کو اتنا نہیں چلنا چاہئے ۔۔۔۔۔۔۔"

"کیا کرتے بیٹی کتنے دنوں سے اخبار نہیں دیکھا تھا"

"میں تو روز آپ کے لئے اخبار لے کر پہنچتی تھی ۔۔۔۔۔۔۔۔۔"

"بیٹی تمہارا شکریہ مگر عمر بھر تو یہاں آکے اخبار پڑھا اور جگہ بیٹھ کر اخبار پڑھنے کی کوشش کروں تو آنکھیں ہی اخبار کو قبول نہیں کرتیں"۔

یہ کہتے کہتے خواجہ صاحب اخبار پر جھک گئے ہم نے بھی موقعہ غنیمت جانا اور وہاں سے سرک آئے اصل میں آج چھٹی کا دن تھا دوستوں اور ان کی بیگمات کے ساتھ ایک

پکنک کا پروگرام طے تھا سو ہمیں جلدی ہی گھر سے نکلنا تھا اور یہ سوچ کر کہ ہم تو گھر ہوں گے نہیں الہ دین کو بھی ایک دن کی چھٹی دے دی جائے سو میں اندر جا کر جلدی جلدی لباس تبدیل کرنے لگا ادھر بیگم بھی بننے سنورنے میں مصروف ہو گئیں۔

بیگم نے لپ سٹک لگاتے لگاتے ڈرائنگ روم میں جھانکا "خواجہ صاحب تو آج آکر جم ہی گئے"۔

"اچھا ابھی تک ان کا اخبار ختم نہیں ہوا"۔

بیگم نے جلدی جلدی لپ سٹک لگا کے ایک دفعہ پھر بال سنوارے ' ہر زاویے سے چہرے کو آئینہ میں دیکھا

ایک بار پھر ڈرائنگ روم میں نظر ڈالی

"اجی دیکھ رہے ہو خواجہ صاحب تو اٹھ ہی نہیں رہے یہ بڑی مشکل ہے"

بیگم نے برہمی سے کہا "پھر آپ نے انہیں پیچھے لگا لیا۔ انہیں کسی طرح رخصت کرو"۔

"دیکھو بیگم اب میں بری الزمہ ہوں اب خواجہ صاحب تمہاری آسامی ہیں"۔

"میری آسامی کیسے ہیں جی"

میں تو ان کی بیماری کے دنوں میں بہت cold رہا ہوں تم ہی دوڑ دوڑ کے ان کی عیادت کو جاتی تھیں

"وہ تو انسانی ہمدردی تھی"۔

"بس ہمدردی ہی ہمدردی میں آدمی مارا جاتا ہے۔ بہر حال چل کر دیکھتا ہوں------"

ٹائی درست کرتا ہوا میں ایک عجلت کے ساتھ ڈرائنگ روم میں گیا بیگم بھی تیار ہو چکی تھیں پیچھے پیچھے وہ بھی چلی آگئیں۔

"خواجہ صاحب آپ آنکھوں پر زیادہ زور مت ڈالیں۔ اب آپ کو آرام کرنا چاہئے"

بیگم نے ٹکڑا لگایا "ہاں ابھی آپ کو آرام کی ضرورت ہے" اور فوراً مجھ سے مخاطب ہوئیں "آپ انہیں پہنچا کر آئیں نا---------"

"نہیں بیٹے میں خود جا سکتا ہوں"

اسی گھڑی الہ دین اخباروں کا ایک ڈھیر لے کر نمودار ہوا وہ پورا ڈھیر اس نے خواجہ صاحب کے سامنے ڈال دیا۔

میں حیران ہوا "یہ کیا............؟"

"خواجہ صاحب بولے" یہ میں نے منگائے ہیں میں نے سوچا کہ پچھلی تاریخوں کے جو اخبار پڑھنے سے رہ گئے ہیں ان پر ایک نظر ڈال لوں میاں یہ اچھا کرتے ہو کہ اخبار محفوظ رکھتے ہو"

یہ بات سن کر میری تو سٹی گم ہو گئی۔ بیگم بھی سخت بدحواس نظر آ رہی تھیں۔ کتنی غصیلی نظروں سے انہوں نے مجھے گھورا۔

"خواجہ صاحب......." میں نے جھجکتے جھجکتے کہا" آپ یہ سب اخبار پڑھیں گے"

خواجہ صاحب نے اخبار پڑھتے پڑھتے اطمینان سے جواب دیا" ہاں بیٹے"

" مگر خواجہ صاحب اتنے اخبار پڑھنے کے لئے تو پورا دن چاہئے۔ اور آپ ابھی بیماری سے اٹھے ہیں"

کوئی بات نہیں خواجہ صاحب نے بے اعتنائی سے کہا اور اخبار پڑھنے میں غرق ہو گئے۔

❋ = = = = = = = ❋
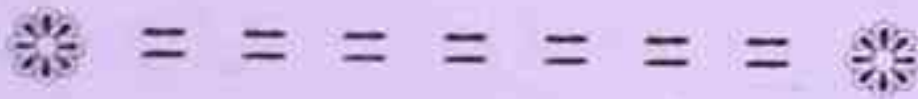
خالی پنجرہ

اس روز ہم نے بچھڑے دوستوں کی گذری صحبتوں کو بہت یاد کیا - تین دوست جو اکٹھے ہو گئے تھے- عامر لندن سے اچانک آنکلا تھا- وہ سمجھ رہا تھا کہ چنڈال چوکڑی اسی طرح جمی ہو گی- اور اسی طرح صحبتیں ہوتی ہوں گی- وہ تو ٹکڑی میں سے بس اپنے آپ کو کم سمجھ رہا تھا- یہ اس کے گمان میں کب تھا کہ پوری ٹکڑی ہی تتر بتر ہو چکی ہے- کہنے لگا کہ "مجھے یہاں کون سا کام تھا- کام تو کراچی میں تھا- سوچا کہ چلو ادھر کا بھی پھیرا لگا لو- دوستوں سے ملاقات ہو جائے گی - مگر کمال ہو گیا- ہم چند برسوں کے لئے غائب ہوئے تھے- ادھر اتنے میں دنیا ہی بدل گئی-----------"

"چلو ' امان اللہ کی طرف چلتے ہیں"- میں نے تجویز پیش کی-" کم از کم ایک دوست ابھی شہر میں موجود ہے"-

"کیا حال ہے اس کا"-

"بہت دنوں سے ملاقات نہیں ہوئی"-

یہ کہتے ہوئے میں نے تھوڑی شرمندگی محسوس کی - " اچھا ہی ہو گا- آزاد بندہ ہے - وقت اس کا کیا بگاڑ سکتا ہے"-

"کب سے نہیں ملے تم"-

"یار زمانہ ہی ہو گیا ملے ہوئے---" شرمندگی کا احساس اور بڑھ گیا- واقعی کتنے زمانے

سے امان اللہ سے نہیں ملا ہوں - کیا وقت تھا کہ گھڑی بھر کے لئے بھی جدا ہونا گوارا نہیں تھا۔ صبح ہوئے شام پڑے رات گئے پھڑ جمی ہے۔ گپ بازی ہو رہی ہے اور اب کیا وقت ہے کہ گئے دنوں کی یاد ایک دوست شہر میں رہ گیا ہے' اس سے کبھی کبھار کی ملاقات بھی موقوف ہے۔ اس بے تعلقی کی کوئی وجہ' کوئی سبب نہیں۔ بس ہے۔ دوستیوں میں عجب ہوتا ہے - ایک وقت میں اتنا اخلاص کہ ملے بغیر روٹی ہضم نہیں ہوتی دوسرے وقت میں یہ عالم کہ ایک شہر میں ہیں مگر نہ میل نہ ملاقات جیسے کبھی تعلق ہی نہیں تھا۔ صحبت جب تک جمی ہے سو جمی ہے - اکھڑ جائے تو دوست سے دوست بارہ پتھر دور۔

"چلو پھر امان اللہ ہی کی طرف چلتے ہیں - وہیں محفل جمے گی"۔

ہم فوراً ہی ادھر چل کھڑے ہوئے امان اللہ کا گھر تو ہمارا مرغوب پڑاؤ تھا۔ امان اللہ چھڑی چھانٹ آدمی۔ نہ کوئی آگے نہ کوئی پیچھے۔ جب منہ اٹھا وہاں جا دھمکے۔ دروازہ اس گھر کا ہم پر ایسے کھلتا جیسے ہمارا انتظار ہی ہو رہا تھا۔ اب بھی جب ہم دونوں پہنچے ہیں تو دروازہ اسی بے تکلفی سے کھلا اور اسی بے تکلفی سے ہمارا خیر مقدم ہوا جیسے ہماری آمد توقع اور معمول کے مطابق ہو۔ "آگئے استاد آجاؤ۔" اور چند ضروری رسمی کلمات کے بعد ایسے گھلے ملے کہ جیسے کبھی جدا ہوئے ہی نہیں تھے۔ میں ڈر رہا تھا کہ امان اللہ مجھے آڑے ہاتھوں لے گا کہ دوسرے یار تو شہر ہی سے دفع ہو گئے مگر تو نے شہر میں ہوتے ہوئے کہاں منہ چھپا لیا۔ مگر اس نے شکوے شکایات میں ذرا جو وقت ضائع کیا ہو' ایسے باتیں شروع کر دیں جیسے ملاقاتوں میں کبھی کوئی وقفہ آیا ہی نہیں تھا۔

"یار تمہارے بعد حفیظ بھی تو ادھر ہی کہیں دفعان ہو گیا تھا۔ اس کی کچھ خیر خبر ہے"۔

"ہاں ایک دفعہ ملاقات ہوئی تھی بتاتا تھا کہ مانچسٹر میں ہے"۔

"وہاں کیا کرتا ہے"۔

"ادھر جانے والوں کے متعلق یہ نہیں پوچھنا چاہئے - وہاں کے دھندے یہاں سمجھ میں نہیں آسکتے۔"

"ہاں جیسے رشید کے متعلق سنا کہ نیویارک کے کسی ہوٹل میں برتن دھونے پر لگا ہوا

ہے۔ میں نے تعجب کیا کہ میرے یار نے یہ کیا کام پکڑا ہے۔ مگر....."

میں نے امان اللہ کی بات کاٹی۔ "یار رشید نے تو کمال کیا۔ کوئی سان گمان ہی نہیں تھا۔ اچانک نکل کھڑا ہوا"۔

"نیویارک کے ہوٹلوں کے جھوٹے برتن اسے پکار رہے تھے"۔ امان اللہ نے ٹکڑا لگایا۔

"اور نثار؟ وہ کہاں گیا؟"

"نثار دوبئی چلا گیا۔ اور بھٹک گیا۔ اچھی کمائی کر رہا ہے"۔

عامر نے ایک ایک دوست کے کوائف معلوم کیے۔ ہم نے ایک ایک دوست کا احوال اسے سنایا۔ پھر پرانی صحبتوں کا تذکرہ شروع ہو گیا۔ بسری باتیں گذرے قصے "امان اللہ ' تمہیں وہ یاد ہے جب ...." اور امان اللہ کے لئے ہر ایسے اشارے نے تیلی کا کام کیا۔ کس لطف کے ساتھ اس نے گذری صحبتوں کو یاد کیا اور غیر اہم سے غیر اہم تفصیل کو بھی کس مزے سے بیان کیا۔ زمانہ گذرنے کے بعد ہماری بے معنی باتوں میں بھی کتنے معنی پیدا ہو جاتے ہیں اور غیر اہم تفصیلات بھی کتنی اہمیت اختیار کر لیتی ہیں اس وقت ہمیں اپنی ہر پچھلی صحبت تاریخی صحبت نظر آ رہی تھی۔ جن باتوں سے اس وقت ہم بور ہوتے تھے اب وہ ہمارے لئے دلکش بن چکی تھیں۔ ان صحبتوں ان باتوں کو یاد کر کر کے ہم کتنا ہنسے۔ اور عامر کی ہنسی تو رکنے ہی میں نہیں آ رہی تھی۔

باتیں کرتے کرتے اچانک عامر کی نظر برآمدے میں لٹکے ہوئے خالی پنجرے پر گئی۔ "یار امان اللہ ' طوطا کہاں گیا"۔

"اڑ گیا"۔

"اڑ گیا؟" عامر بھونچکا رہ گیا۔ "کیسے اڑ گیا؟"

"کھڑکی کھلی رہ گئی - اڑ گیا"۔

"اچھا؟ .... تعجب ہے"۔

"تعجب کی اس میں کیا بات ہے"۔

میں یوں ہی بول پڑا۔ "پرندہ تھا۔ اڑ گیا"۔

"پرندہ تو تھا مگر یار وہ تو ہماری ڈار میں شامل تھا۔ یاد نہیں جب ہم آتے تھے تو کتنا پھڑکتا چہکتا تھا۔ اور ہم بھی اس کا باقاعدہ نوٹس لیتے تھے۔ اپنے کھانے پینے میں برابر شریک کرتے تھے"۔

عامر کے اس بیان پر وہ پوری تصویر میری آنکھوں میں کھنچ گئی۔ ہمارے آنے پر کتنا تڑپتا تھا جیسے پنجرے کی تیلیاں توڑ کر باہر نکل پڑے گا اور کتنا شور مچاتا تھا اس کی تڑپ اس کی چہکار میں مسرت کی ایک عجب لہر ہوتی تھی۔ خم کھاتی ہوئی لال چھچھا چونچ' باقی ایک دم سے ہرا۔ اور اس کی دم کتنی لمبی تھی کہ پنجرے میں کسی طور سماتی ہی نہیں تھی۔ اس کے دم سے پنجرہ رنگ اور حرارت سے لبالب بھرا دکھائی پڑتا تھا۔ اور اب کتنا بے رونق کتنا اجڑا اجڑا نظر آرہا تھا۔

"یار مجھ سے ہی چوک ہوئی"۔ امان اللہ نے بہت ضبط کیا' مگر پھر شروع ہو گیا۔ "مجھے اس پر کچھ زیادہ ہی اعتبار ہو گیا تھا۔ یہ سوچا ہی نہیں کہ آخر پرندہ ہے۔ کھڑکی کھلی پڑی رہتی تھی اور میں اس پر دھیان ہی نہیں دیتا تھا۔ کئی مرتبہ ایسا ہوا کہ کھڑکی کھلی دیکھ کر باہر نکل آیا۔ صحن میں چہل قدمی کی اور پھر خود ہی اندر آگیا۔ میرا اعتبار اور بڑھ گیا۔ پر اس کی ایک حرکت کو میں نظر انداز کر گیا۔ کمبخت یہ جو ہمارے برابر کے گھر میں امرود کا پیڑ ہے اس کی وجہ سے اپنے مٹھو میاں کا چال چلن بگڑا۔ جب اس پر امرود لگتے ہیں تو طوطے کی ڈاریں اس پر بہت اترتی ہیں۔ بس ان گھڑیوں میں مٹھو بہت بےچین ہوتا تھا۔ سخت تڑپتا پھڑکتا تھا۔ بس کسی ایسی ہی گھڑی میں اس نے کھڑکی کھلی دیکھی اور ہماری ڈار سے ٹوٹ کر ہم جنسوں کی ڈار میں جا ملا"۔

"یار مٹھو کمال تھا۔" عامر کہنے لگا "ہمارے کھانے پینے میں اپنے آپ کو برابر کا حقدار سمجھتا تھا۔ ہم اسے دینے میں کوتاہی کرتے یا ذرا تاخیر کرتے تو روٹھ جاتا تھا۔ پھر بہت مشکل سے منتا تھا"۔

"لو روٹھنے پہ مجھے ایک دن کی بات یاد آگئی" امان اللہ کہنے لگا۔ "صبح ناشتے کے بعد

میرا طور چلا آتا تھا کہ توس کا ایک ٹکڑا پہلے مٹھو کی نذر کرتا۔ پھر توس اور روٹی کے بچے کھچے ٹکڑوں کو ریزہ ریزہ کر کے کبوتروں کے لئے ڈال دیتا ایک دفعہ بے دھیانی میں پہلے کبوتروں کو ناشتہ کرا دیا۔ بس مٹھو خاں اینٹھ گئے۔ جہاں میں نے توس کا ٹکڑا پنجرے میں ڈالنے کی کوشش کی اس نے میرے چونچ ماری اور بڑبڑانے لگا۔ اس بندے نے اس روز سارے دن کچھ نہیں کھایا۔ جیسے عورتیں انٹوانٹی کھٹوانٹی لے کے پڑ جاتی ہی ویسے ہی میری طرف سے منہ موڑ کر آنکھیں موند کر بیٹھا رہا۔ یار طوطا کیا تھا' بالکل عورت تھا"۔ امان اللہ چپ ہوا۔ پھر آہستہ سے بولا۔" بے وفائی بھی اسی کی طرح کی"۔ ٹھنڈا سانس بھرا اور چپ ہو گیا۔

امان اللہ اداس ہو گیا تھا۔ اداس تو ہم بھی ہو گئے تھے۔ ادھر خالی پنجرہ اداسی کی تصویر بنا لٹک رہا تھا۔ مجھے یوں ہی خیال آیا کہ اب یہ پنجرہ خواہ مخواہ یہاں کیوں لٹکا ہوا ہے۔ اب اس کی بالکل وہی حیثیت تھی جو کسی جوڑے کے نقل مکانی کے بعد گھونسلے کی ہوتی ہے۔ گھونسلہ اپنے مکینوں کے دم سے کتنا زندگی سے بھرا ہوا نظر آتا ہے۔ سارے تنکوں میں حرارت کی ایک رو جاری ہوتی ہے۔ مکینوں کی ہجرت کے بعد کتنا مردہ دکھائی دیتا ہے۔ میں نے کہا" امان اللہ یار مٹھو کو بھول جاؤ۔ اب کوئی نیا طوطا خرید لاؤ اور اس پنجرے کو آباد کرو"۔

امان اللہ نے برہمی سے کہا۔" نہیں"۔

"کیوں"

"کوئی دوسرا طوطا مٹھو کی جگہ نہیں لے سکتا"۔

"پھر اس پنجرے کو اتار کر پھینکو یا کہیں اندر ڈال دو"۔

"نہیں یار"۔ اب اس کے لہجہ میں بیچارگی کا رنگ پیدا ہو گیا۔

"کیوں"؟

"یار میں نے بتایا نا کہ پڑوس والے امرود پر طوطوں کی ڈاریں بہت اترتی ہیں۔ کیا پتہ ہے کسی دن کسی ڈار کے ساتھ وہ بھی چلا آئے۔ پنجرے کو دیکھے تو شاید اسے اپنا چھوڑا ہوا

گھر یاد آجائے"۔

میں نے کہا" کبوتر چھوڑے ہوئے گھر کو یاد رکھتا ہے۔ کھویا ہوا کبوتر مہینے مہینے بھر بعد تک واپس آتے دیکھا گیا ہے ۔مگر طوطا ایک دفعہ اڑ جائے تو پھر واپس نہیں آتا"۔

امان اللہ نے بڑی بیچارگی سے مجھے دیکھا بولا" تم ٹھیک کہتے ہو۔ مگر میں پنجرے کی کھڑکی کھلی رکھتا ہوں اور روز صبح کو پیالی کا پانی بدلتا ہوں کہ شاید......"

عامر جواب افسردہ اور چپ تھا تائیدی لہجہ میں آہستہ سے بولا۔" ہاں شاید.....

❁ = = = = = = = ❁

اختر بھائی

اختر بھائی کو میں نے زمانے بعد دیکھا اور حیران ہوا۔ یہ وہ اختر بھائی تھے ہی نہیں۔ وقت کے ساتھ آدمی کتنا بدل جاتا ہے۔ بیٹے کو ڈانٹ پھٹکار رہے تھے۔ میں نے پوچھا "اختر بھائی، آپ غریب پر کیوں برس رہے ہیں"۔

بولے "بے ایمان کہتا ہے کہ شادی نہیں کروں گا۔ میں نے کتنا سمجھایا مگر وہی مرغے کی ایک ٹانگ۔ اس کی سمجھ میں بات ہی نہیں آتی"۔

میں ان کا منہ تکنے لگا۔ مجھے پرانے اختر بھائی یاد آگئے۔ کیا آزاد مخلوق تھے۔ جان کے ساتھ کوئی روگ پالا ہی نہیں تھا۔ دنیا جہاں کے قصوں سے آزاد۔ نے غم دنیا نے غم کالا۔ اپنے حال میں مگن۔ من موجی۔ جس وقت جو لہر آئی اس پر چل پڑے۔ گھر سے نہیں نکلے تو بالکل ہی نہیں نکلے۔ کمرے میں بند پڑے ہیں۔ سگریٹ کا دھواں اڑا رہے ہیں، کتاب پڑھ رہے ہیں۔ کئی کئی دن اسی عالم میں گذر جاتے تھے کہ نہ باہر نکلنا نہ آسمان دیکھنا۔ سنک سوار ہوئی تو گھر سے نکل پڑے۔ پھر کئی کئی دن کے لئے گھر سے غائب۔ جب دوست کے گھر پہنچ گئے بس وہاں ڈیرے ڈال دیئے۔ چائے کا دور چل رہا ہے اور فلیش کی بازی لگ رہی ہے۔ پتوں میں ایسے غلطاں کہ خبر ہی نہ ہوتی کہ کب دن ڈھلا، کب رات ہوئی۔ اپنا ہی ہوش نہ رہتا دن رات کس گنتی میں تھے۔

دو چیزوں سے اختر بھائی بہت بدکتے تھے۔ شادی سے اور ملازمت سے۔ بدکنا چاہیے

بھی تھا- پھر تو آدمی کے پاؤں میں بیڑیاں پڑ جاتی ہیں- اختر بھائی بقائمی ہوش وحواس پاؤں میں بیڑیاں کیسے پہن سکتے تھے- خیر ملازمت کرنے کی تو انہیں یوں بھی ضرورت نہیں تھی- والد صاحب اتنا چھوڑ گئے تھے کہ مزے سے گزر بسر ہوتی تھی- بھائی بہن کوئی تھا ہی نہیں- ماں نے ایک ہی پوت جنا تھا- اور جن کر اللہ کو پیاری ہو گئی- بس ایک پھوپھی جان کا سایہ سر پر تھا- جائیداد سے اتنی آمدنی تھی کہ فلیش میں سینکڑوں ہارنے کے بعد بھی ہاتھ کھلا رہتا تھا- پھوپھی جان کو باقی جو بھی شکایتیں ہوں خرچ کے سلسلہ میں انہیں کبھی شکایت نہیں ہوئی- اور بھی انہیں کون سی ایسی شکایتیں تھیں- بس ایک ہی رونا گانا تھا کہ بیٹے شادی نہیں کرو گے تو باپ کی نسل آگے کیسے چلے گی- جوں جوں اختر بھائی کی عمر بڑھ رہی تھی توں توں پھوپھی جان کا رونا گانا زور پکڑ رہا تھا-

اختر بھائی کی عمر اچھی خاصی ہو گئی تھی- کنپٹی کے بال سفید ہو چکے تھے- یوں سمجھ لو کہ ہم دوستوں میں وہ سب سے بڑے تھے- اسی لئے کبھی کبھی بزرگ بھی بن جاتے تھے- اور وہ ہر پھر کر شادی کا موقع ہوتا تھا- جو دوست شادی کرنے لگتا پہلے اسے سمجھاتے کہ میاں کس جھمیلے میں پڑ رہے ہو- جب دوست باز نہ آتا تو پھر براتیوں میں سب سے آگے نظر آتے- دولہا کا باپ پیچھے ہوتا وہ آگے ہوتے-

اختر بھائی کے دوستوں کے حلقہ میں ہم سب ہی تھے- لیکن نصراللہ سے اختر بھائی کو زیادہ ہی انس تھا- شاید اسی لئے انہوں نے شادی کے معاملہ میں زیادہ سمجھایا کہ یار جانے دے- پھنس جائے گا- بلکہ جب سہرا بندھ گیا اور نصراللہ کار میں بیٹھنے لگا تو انہوں نے کان میں کہا کہ اے ناعاقبت اندیش ' اب بھی وقت ہے- سوچ لے- مگر یہ مشورہ بھی دوستوں کے قہقہوں میں گم ہو گیا- اختر بھائی بولے "میں نے اپنا فریضہ ادا کر دیا- باقی قسمت کے لکھے کو تو کوئی بدل نہیں سکتا-" اور اس کے بعد وہ برات میں پیش پیش دیکھے گئے- حتیٰ کہ جب نکاح کے وقت جھگڑا کھڑا ہوا تو اس وقت بھی وہ پیش پیش رہے- یہ الگ بات ہے کہ اس معاملہ میں ان کی ایک پیش نہ گئی-

جھگڑا عجب کھڑا ہوا- بس ایک ٹیکنیکل مسئلہ تھا- کم از کم اختر بھائی کی نظر میں ٹیکنیکل

مسئلہ تھا۔ کہتے تھے کہ صیغہ کا مسئلہ محض ایک میکینکل مسئلہ ہے۔ نکاح یوں پڑھا جائے یا ووں پڑا جائے کیا فرق پڑتا ہے۔ مگر فریقین کے لئے یہ دین ایمان کا مسئلہ تھا۔ سید صفدر علی آخر میں نیچے پڑ گئے تھے کہ چلو بغیر صیغہ کے ہی نکاح ہو جائے۔ مگر پانی اس وقت تک سر سے اونچا ہو چکا تھا۔ اختر بھائی نے اپنی طرف سے کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ نصراللہ کے والد صاحب کو بہت سمجھایا کہ جانے دیجئے اس جھگڑے کو۔ برات واپس لے جانا بہت غیر شریفانہ حرکت ہے۔ مگر انہوں نے اختر بھائی کی ایک نہ سنی۔ اختر بھائی کا امن مشن فیل ہو گیا۔ برات واپس ہو گئی۔

اختر بھائی اپنے امن مشن میں ناکام ضرور ہوئے مگر اپنے موقف سے وہ منحرف نہیں ہوئے۔ واپس جاتی ہوئی برات کے ساتھ واپس جانے سے انہوں نے صاف انکار کر دیا۔ غصیلی نظروں سے نصراللہ کو دیکھا "مجھے پتہ نہیں تھا کہ تم اتنے ذلیل آدمی ہو"۔ پھر نصراللہ کے والد سے کہا "معاف کیجئے، میں آپ لوگوں کے ساتھ واپس نہیں جا سکوں گا"۔

"یہیں رہو گے؟"

"یہ آپ کا مسئلہ نہیں ہونا چاہئے۔ آپ اپنے بیٹے کو تو جوں کا توں لے جا رہے ہیں۔ آپ کے اطمینان کے لئے یہ بات کافی ہونی چاہئے"۔

برات کے واپس جانے کے بعد اختر بھائی نے سید صفدر علی سے اس طرح معذرت کی اور اس طرح پشیمانی کا اظہار کیا جیسے سارا قصور انہی کا تھا۔ پھر تلافی کی ٹھانی اور دو ٹوک اپنے آپ کو نصراللہ کے بدل کے طور پر پیش کر دیا۔

یہ پیش کش اتنی اچانک اور غیر متوقع تھی کہ سید صفدر علی سٹپٹا گئے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس کا کیا جواب دیا جائے۔ سمجھ میں بھی کیسے آتا۔ اس وقت ان کے ہوش ہی بجا نہیں تھے۔ ایسے میں ان کے بھائی سید حیدر علی نے ہوش مندی دکھائی۔ اختر بھائی سے انسانیت کے ساتھ بات کی "میاں ہم تو تم سے واقف ہیں۔ اچھے لڑکے ہو۔ اچھے خاندان سے ہو۔ مگر تم نے بھی ہماری لڑکی اور ہمارے خاندان کے متعلق کچھ پوچھ گچھ کر لی ہوتی تو اچھا ہوتا"۔

"میں اس کی کوئی ضرورت محسوس نہیں کرتا"۔

"یہ تو تمہیں پتہ ہے کہ صیغہ کے سوال پر یہ جھگڑا کھڑا ہوا تھا"۔

"یہ محض ٹیکنیکل مسئلہ ہے۔ مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے"۔

"تم نے اپنے بزرگوں سے بھی پوچھ لیا ہوتا تو اچھا ہوتا۔ آخر کوئی سردھڑ تو ہونا چاہئے"۔

"اگر آپ ضروری سمجھتے ہیں تو فون لایئے میں پھوپھی جان کو بلوائے لیتا ہوں"۔

جھٹ پٹ پھوپھی جان کو فون کیا گیا کہ چھوہاروں کی ایک تھالی لے کر جلدی آجایئے پھوپھی جان سٹپٹا گئیں۔

"ارے بیٹا یہ تو کیسی باتیں کر رہا ہے۔ یہ کوئی گڑیوں کا کھیل ہے۔ ساری زندگی کا معاملہ ہے۔ پہلے سوچو سمجھو۔ ہتھیلی پر سرسوں مت جماؤ"۔

"پھوپھی جان Now Or Never

"بیٹے، تمہاری یہ ہٹ میری سمجھ میں نہیں آتی"۔

"پھوپھی جان، مطلب یہ ہے کہ آپ کے بھتیجے کی شادی اب اسی وقت اسی گھڑی ہو گئی تو ہو گئی ورنہ پھر کبھی نہیں ہو گی۔ سوچ لیجئے"۔

پھوپھی جان بھی بھتیجے کے مزاج کو خوب سمجھتی تھیں۔ یہ سن کر فوراً اٹھ کھڑی ہوئیں۔

اختر بھائی براتی بن کر سید صفدر علی کی ڈیوڑھی پر گئے تھے۔ داماد بن کر واپس ہوئے۔

بس اس کے بعد ہی سے اختر بھائی بدلنا شروع ہو گئے تھے۔ ملازمت تو میرے ہوتے ہوئے ہی کر لی تھی۔ یہاں کا جو اکلوتا کالج تھا اس میں لیکچرار ہو گئے۔ پھر میں ملازمت کے سلسلہ میں باہر چلا گیا۔ پھر باہر ہی رہا۔ گھر والے خود ہی چلے آئے۔ میں کسی تقریب میں یہاں کا پھیرا لگاتا۔ اب آیا تو یہاں کی دنیا ہی بدلی ہوئی تھی۔ عرصہ بھی تو بہت لمبا ہے۔ اس عرصے میں اختر بھائی ایک بیٹی ایک بیٹے کے باپ بن گئے۔ ایک داماد کے خسر بن گئے۔ اب اس فکر میں تھے کہ بیٹے کی شادی کر کے فراغت حاصل کریں کہ دنیا سے سکون

واطمینان سے رخصت ہوں۔

"تم نے دیکھا ہے آج کل کی اولادوں کا حال"۔ اختر بھائی اس کے چلے جانے کے بعد بولے۔

※ = = = = = = = ※

مچکند

مچکند بہت تھک گیا تھا اور سونا چاہتا تھا - تھکنا تو اسے تھا ہی - لڑائیاں جو بہت لڑی تھیں- لڑائیاں بھی ایسی ویسی نہیں- جب دیوتاؤں اور اسروں کے بیچ رن پڑا تھا تو یہ مٹی کا پتلا اور زمین کا باسی بھی میدان میں جاکودا اور دیوتاؤں کے کندھے سے کندھا ملا کر ایسا لڑا کہ اسروں کے چھکے چھڑا دیئے- اس کی اسی بہادری سے خوش ہو کر دیوتاؤں نے اسے ایک انوکھی طاقت بخش ڈالی- اس کی آنکھوں میں دشمنوں کے لئے قہر پہلے ہی بھرا رہتا تھا، اب اس میں یہ طاقت پیدا ہو گئی کہ جسے قہر کی نظر سے دیکھتا وہ جل کر بھسم ہو جاتا-

مچکند جب اسروں سے نبٹ کر پلٹا تو تپ میں بیٹھے رشیوں نے دہائی دی کہ اے راجہ تو آسمانوں میں جا کر اسروں سے لڑا- مگر کچھ زمین کی بھی تو فکر کر- یہاں بنوں میں راکشس دندناتے ہیں اور ہماری تپ میں کھنڈت ڈالتے ہیں- مچکند نے یہ سن کر تاؤ کھایا اور راکشسوں سے بھڑ گیا- کتنوں کو اس نے قہر بھری نظروں سے دیکھا اور جلا کر راکھ کر دیا- جو بچ گئے وہ ایسے بھاگے کہ بن میں دور دور تک ان کا پتہ نہیں تھا- تپ ون راکشسوں سے پاک ہو گیا- رشیوں نے مچکند کو سینکڑوں دعائیں دیں-

یہ خبر بن سے نکل کر نگر نگر پہنچی- وہاں لوگوں نے جھرجھری لی اور مچکند کو دہائی دی کہ اے مہاویر تو نے اسروں سے ٹکر لی اور راکشسوں کا زور توڑا - کچھ ان راجاؤں کا بھی اپائے کر جو اسروں اور راکشسوں سے بڑھ کر پاپی ہیں اور پرجا کے لئے مصیبت بنے ہوئے

ہیں- مشکند یہ درد بھری دہائی سن کر تاؤ میں آیا اور ان راجاؤں پر پل پڑا ایک ایک پاپی راجہ کو ٹھکانے لگایا اور انیائے کو ختم کیا- ان راجاؤں کی ستائی ہوئی پرجا نے سکھ کا سانس لیا-

یوں مارا مار کرنے کے بعد مشکند اپنی راجدھانی کو لوٹا- اتیا چاری راجاؤں سے بن اور نگر پاک ہو چکے تھے- اب چاروں طرف شانتی ہی شانتی تھی- مشکند نے سوچا تھا کہ اب وہ نچنت ہو کر راج کرے گا اور جنتا کے بھلے کے کام انجام دے گا- مگر اس نے ابھی یہ سوچا ہی تھا کہ اسے تھکن نے آلیا- تھکن نے اور نیند نے- سنگھاسن پہ ایک دن بیٹھنا اسے نصیب نہ ہوا- بھرے دربار سے یہ کہہ کر اٹھ کھڑا ہوا کہ مترو میں بہت تھکا ہوا ہوں - سونا چاہتا ہوں-

راج محل کب سے سونا پڑا تھا- اب جو راجہ واپس آیا تو جیسے سوکھے دھانوں پہ پانی پڑ گیا- پورے محل میں خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی- برس برس کا سناٹا ٹوٹا- خوشی کے گیت گائے جانے لگے- فضا میں قہقہے گونجنے لگے- مگر جس آدمی کو نیند آرہی ہو اسے کچھ بھی بھلا نہیں لگتا نہ ہنسی دلگی نہ گیت سنگیت- راج محل کی چہل پہل راجہ کو اکھرنے لگی- دل میں سوچا کہ یہاں تو بہت شور ہے - میں سوؤں گا کیسے- جی میں عجب سمائی کہ راج محل سے نکلو اور کسی چپ جگہ پر جا کر لمبی تان کر سو رہو- سو اس نے منتری کو ساتھ لیا اور محل سے نکل گیا-

محل سے باہر بھی کونسی خاموشی تھی- راجدھانی اپنے راجہ کی واپسی پر خوشی منا رہی تھی - آنند منگل گائے جا رہے تھے- خوشی کی تانیں لگائی جا رہی تھیں- چہلیں ہو رہی تھیں- قہقہے لگائے جا رہے تھے- مشکند سارے نگر میں گھوم گیا- کوئی ایسا کونا نہ ملا جہاں چپ کا راج ہو اور وہ اطمینان سے سو سکے- جدھر جاؤ شور ہی شور- ویسے تو وہ خوشی کا شور تھا مگر مشکند کو اس سے خفقان ہونے لگا- اسی خفقان میں وہ نگر کو چھوڑ بن میں نکل گیا-

نگر کا شور پیچھے رہ گیا تھا- لیکن بنوں کا اپنا شور ہوتا ہے- شیروں کی دہاڑ، ہاتھیوں کی چنگھاڑ ڈال ڈال پنچھی بیٹھے تھے اور اپنی اپنی بولی بول رہے تھے- ایک درخت پہ بہت سے

طوطے بیٹھے تھے اور بہت ٹائیں ٹائیں کر رہے تھے۔ مشکند جھنجلا گیا۔ اس نے قہر کی آنکھ سے انہیں دیکھا اور وہ سب کے سب دم کے دم میں جل کر بھسم ہو گئے۔

پاس ہی ایک برگد تلے ایک جوگی انگ پہ بھبھوت ملے دھونی رمائے بیٹھا تھا اس نے یہ دیکھا تو دکھ سے بولا کہ "راجہ تو نے طوطوں کے ساتھ اچھا نہیں کیا"۔

راجہ نے پلٹ کے جواب دیا؟ طوطوں نے بھی تو میرے ساتھ اچھا نہیں کیا تھا۔ میں نگر کے شور سے بھاگ کر بن میں آیا تھا۔ یاں پہ پنچھیوں نے شور مچا رکھا ہے۔ اور طوطوں کے شور سے تو میرے کان پھٹے جا رہے تھے"۔

جوگی زہر بھری ہنسی ہنسا بولا " راجہ آکاش تلے تو شور ہی شور ہے"۔

"پھر میں کہاں جاؤں۔ مجھے تو نیند آ رہی ہے یہ شور مجھے سونے نہیں دے رہا"۔

"بس اتنی سی بات تھی۔ اس میں کونسا پیچ ہے۔ یاں پہ پربت ہیں ان میں اتنی گپھائیں ہیں کسی گپھا میں گھس جا اور سو جا"۔

یہ بات مشکند کے جی کو لگ گئی اس نے گھوم پھر کر ایک اجاڑ جگہ میں ایک گہری اندھیری کھوہ کو تاڑا۔ اس کے بیچ کشا گھاس بچھائی۔ پھر منتری سے کہا کہ میں سونے لگا ہوں تم جا کر راج کے کاج سنبھالو۔ میرے سوتے ہوئے راج میں سکھ چین رہنا چاہئے اور ایک بات کا دھیان رکھنا کہ کوئی یاں آ کر مجھے نہ جگائے۔ جو ایسا کرے گا میں اسے جلا کر بھسم کر دوں گا۔ بس جب نیند پوری ہو جائے گی تو میں خود ہی جاگ پڑوں گا اور آ کر راج سنبھالوں گا۔"

منتری یہ سن واپس راجدھانی چلا گیا۔ ادھر مشکند لمبی تان کر سو گیا۔

مشکند ایسا بے سدھ سویا کہ صدیاں بیت گئیں اور اس نے کروٹ تک نہیں لی۔ جیسے جنم جنم کی نیند اس کی آنکھوں میں اتر آئی ہو۔ وہ اندر کھوہ میں پڑا سویا رہا' ادھر باہر زمانہ نے کتنی کروٹیں بدل لیں سویا مویا برابر۔ مشکند نیند میں تھا۔ اسے کیا پتہ کہ دنیا کیا سے کیا ہو گئی۔ بنوں میں راکشس پھر دندنانے لگے تھے۔ بستیوں میں پاپیوں دشٹوں کی بن آئی تھی۔ راجاؤں کے طور بدل گئے تھے ظلم ان کا چلن بن گیا تھا۔ لوگ ظلم کی چکی میں بری طرح

پس رہے تھے - اور متھرا نگری میں تو حد ہی ہو گئی- راجہ کنس نے ماؤں کی گودیں خالی کر دیں اور سہاگنوں کے سہاگ اجاڑ دیئے- مگر اسی بیچ ایک واقعہ اور بھی ہوا- اسی متھرا نگری میں بسدیو کے گھر میں چاند سا بیٹا پیدا ہوا جس کا کنس کو پتہ ہی نہ چلا- وہ بیٹا برندابن میں پلا بڑھا- اور پھر کیا ہوا کہ اس نے گائیں چراتے چراتے اور بانسری بجاتے بجاتے تلوار اٹھائی اور متھرا میں آکر کنس کو ٹھکانے لگا دیا- متھرا والوں نے سکھ کا سانس لیا- مگر جلدی ہی پتہ چلا کہ وہ اپنے پیچھے اپنے جیسے کتنوں کو چھوڑ گیا ہے- یہی ہوا کرتا ہے - ظالم جیتے جی ایک نظر آتا ہے- لگتا ہے کہ وہ ٹھکانے لگ جائے تو ظلم کا انت ہو جائے گا- جب وہ ٹھکانے لگ جاتا ہے تو پتہ چلتا ہے کہ اس جیسے کتنے ہی موجود ہیں- بسدیو کے بیٹے نے کتنوں کو ٹھکانے لگایا مگر پھر بھی کتنے ہی بچ رہے-

بچ جانے والوں میں ایک راجہ کالیون تھا- مدھوسودن نے اسے چیتاونی اس رنگ سے دی کہ ایک ہنڈیا میں ایک زہری ناگ بند کیا اور اس کے پاس بھیج دیا- مگر کالیون بھی ایک زہری تھا- اس نے جواب یوں دیا کہ ڈھیر ساری چیونٹیاں ہنڈیا میں انڈیلیں اور ہنڈیا مدھو سودن کو واپس بھیج دی- مدھو سودن نے ہنڈیا کھولی تو دیکھا چیونٹیوں نے ناگ کا بھرتا بنا دیا ہے- یہ دیکھ وہ بہت سٹپٹایا تب ناردمنی نے اس کے پاس آکر یہ کہا کہ "اے بسدیو کے بیٹے کالیون تیرے بس میں نہیں آئے گا- اس کی موت کسی اور کے ہاتھ لکھی ہے"-

"وہ کون مائی کا لال ہے"-

"وہ مشکند ہے جس کی چتون میں اتنا قہر بھرا ہوا ہے کہ اسے وہ ایک نظر دیکھے گا اسے خاک کر ڈالے گا-"

"ہے ناردمنی مشکند کہاں ہے"-

"مشکند تو یہاں سے دور ایک کھوہ میں پڑا سو رہا ہے"-

"منی جی اس کھوہ کا پتہ دو- میں مشکند کو جاکر جگاتا ہوں"-

"ہے مدھو سودن کھوہ کا پتہ تو میں دیئے دیتا ہوں- پر تو خود اسے مت جگائیو جو بھی اسے جگائے گا وہ اسے جلا کر بھسم کردے گا- بس تو اتنا کر کہ اس کھوہ میں دبے پاؤں جا

اور راجہ کے سرہانے جا بیٹھ - کالیون تیری کھوج میں ہے- وہ تیرے پیچھے پیچھے وہاں جائے گا- وہ مورکھ اپنے گھمنڈ میں آکر اسے جھنجھوڑے گا- بس تیرا کام بن جائے گا"-

بسدیو کے بیٹے نے ایسا ہی کیا- ناردمنی سے پتہ لے کر کھوہ میں پہنچا- راجہ مشکند بے سدھ پڑا سو رہا تھا- چپکے سے اس کے سرہانے جا بیٹھا - کالیون اس کا پیچھا کرتے کرتے وہاں پہنچا- دیکھا کہ ایک پرش ڈھوہ کا ڈھوہ پڑا خراٹے لے رہا ہے- کالیون نے اپنے گھمنڈ میں اسے ٹھوکر ماری- مشکند کی نیند میں خلل پڑا - آنکھ کھل گئی قہر بھری نظروں سے دیکھا کہ کون ہے جس نے اسے جگایا ہے- بس دیکھنا تھا کہ کالیون کھڑے کھڑے ایسے جل کر بھسم ہوا جیسے بن کا سوکھا پیڑ جلے اور دم کے دم میں راکھ کا ڈھیر بن جائے-

کالیون پھر سونے لگا تھا کہ بسدیو کے بیٹے نے اپنی مرلی بجانی شروع کر دی- مرلی کی مدھر لے میں مشکند کی آنکھوں میں بھری نیند اور غصہ دونوں بہہ گئے- اس نے لیٹے لیٹے تھوڑی سخت آواز میں کہا "کس کی موت آئی ہے کہ میری نیند میں خلل ڈال رہا ہے"-

"مہاراج مرلی میں نے اس کارن بجائی ہے کہ تمہارے جاگنے کا سمے ہو گیا ہے"-

"تو مجھے جگانے والا کون ہے"؟

"میں کرشن کنھیا ہوں"-

"کون کرشن کنھیا"-

"بسدیو کا پتر کرشن کنھیا"-

"کون بسدیو"-

بسدیو کے بیٹے نے بسدیو کے باپ کا نام بتایا پھر بسدیو کے باپ کے باپ کا نام بتایا- پھر اس کے باپ کا - پھر اس باپ کے باپ کا - مگر ہر نام پر مشکند نے یہی کہا کہ وہ کون ہے- آخر اس نے کہا کہ "یادو کا نام تو مہاراج تم نے سنا ہو گا"-

"ییاتی کا پتر یادو"؟

"ہاں ییاتی کا پتر یادو"

"ہاں اس بالک کو میں نے دیکھا تھا- جب میں اپنے راج محل سے سونے کے لئے نکلا

تھا اور نگر نگر پھر رہا تھا تو وہ ایک گلی میں بالکوں کے ساتھ کھیل رہا تھا"۔

"بس مہاراج میں اسی کے بنس سے ہوں"۔

مشکند حیران ہوا۔ "اس بالک نے میرے سوتے سوتے اتنی پیڑیوں کو جنم دے دیا۔ اس نے پھرتی دکھائی یا میں لمبا سویا"۔

"مہاراج، تم لمبے سوئے"۔

"آخر کتنا"۔

"بس یہ سمجھو کہ جگ بیت گیا"۔

"جگ بیت گیا" مشکند نے حیران ہو کر کہا" مترمیں تریتا یگ میں سویا تھا"۔

"اور اب کلجگ ہے"۔

"کلجگ لگ گیا"؟ مشکند ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا "کیا تو سچ کہہ رہا ہے"

"ہاں مہاراج، میں سچ کہہ رہا ہوں۔ کلجگ لگ چکا ہے"۔

"نارائن، نارائن، نارائن"۔ مشکند بیکل ہو کر اٹھ کھڑا ہوا اور تیزی سے کھوہ سے نکل لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا چلا۔ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ارد گرد دیکھتا جاتا تھا۔ یہ دنیا ویسی تو نہیں ہے جیسی میرے سونے سے پہلے تھی اسے گمان ہوا کہ شاید وہ سوتے سے ابھی ابھی اٹھا ہے اس لئے اسے دنیا بدلی بدلی نظر آ رہی ہے۔ شاید نہیں بدلی ہے اور ویسی ہی ہے۔ اس نے ایک دفعہ تو آنکھیں ملیں اور غور سے اردگرد نظر ڈالی۔ ارے یہ تو سب کچھ ہی بدل گیا ہے۔ مگر کیا بدلا ہے، یہ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ گھبراہٹ میں اس نے زیادہ تیز تیز چلنا شروع کر دیا۔

مدھوسودن نے بڑھ کر پوچھا "مہاراج کدھر جا رہے ہو۔

"اپنی راجدھانی چل کر دیکھتا ہوں کہ اس کا کیا حال ہے۔ کتنے دنوں سے سنگھاسن خالی پڑا ہے۔ راج کے کتنے کام تھے جو مجھے کرنے تھے اور یہ سوچ کر چھوڑ دیئے تھے کہ ایک نیند لیلوں پھر کروں گا"۔

"مہاراج جو آخری کام تمہیں کرنا تھا۔ وہ تم نے کر دیا۔ کالیون کو ٹھکانے لگا دیا۔ باقی

کام دوسرے کرتے رہیں گے۔ اور سنگھاسن کی بات یہ ہے کہ کوئی سنگھاسن کبھی خالی نہیں رہا کرتا۔"

مشکند نے اسے گھور کر دیکھا "بالک تو مجھے عقل سکھائے گا اگر تو نے مجھے کلجگ کی خبر نہ دی ہوتی تو میں ابھی تجھے جلا کر بھسم کر دیتا۔ جا اپنا رستہ لے اور مجھے اپنے رستے پہ جانے دے" یہ کہہ کر مشکند تیزی سے آگے بڑھ گیا۔

مشکند بنوں سے نکل کر جب بستیوں سے گذرا تو اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ دنیا تو اوپر تلے ہو چکی ہے سچ مچ کلجگ آگیا ہے۔ جس بستی سے گذرا یہی دیکھا کہ کوئی چیز اپنی جگہ پر نہیں ہے سب الٹ پلٹ ہے۔ چور راجہ بنے بیٹھے ہیں، راجہ چور بن گئے ہیں۔ ان پڑھوں نے ودھوانوں کا روپ دھارا ہے اور لوگ ہیں کہ انہیں سر آنکھوں پہ بٹھا رہے ہیں۔ جو ودھوان ہیں انہیں کوئی نہیں پوچھتا کہ کس کھیت کی مولی ہو۔ بے ہنر ہنر مند سمجھے جاتے ہیں، سونے میں تلتے ہیں۔ ہنر مند خاک پھانکتے پھرتے ہیں۔

مشکند حیران اور پریشان تھا کہ دنیا کو کیا ہو گیا ہے۔ اسی حیرانی اور پریشانی میں چلتے چلتے وہ اپنی راجدھانی میں پہنچا۔ وہاں کا رنگ بے رنگ دیکھا۔ جہاں دولت کی گنگا بہتی تھی وہاں کا یہ حال کہ لوگ پھٹے حالوں پھرتے ہیں، دانے دانے کو ترستے ہیں، ہاہا کار مچی ہے، نراش کی گھٹا چھائی ہے۔ راج دربار میں جھانکا تو اور بھی اچنبھا ہوا، پھر غصہ آیا کہ یہ بالشت بھر کا بدصورت آدمی کون ہے کہ اس کے سنگھاسن پہ آن بیٹھا ہے۔ سوچا کہ اسے قہر کی آنکھ سے دیکھو اور جلا کر بھسم کر دو۔ ابھی اس نے یہ سوچا ہی تھا کہ دربان نے آکر ٹوکا کہ کون ہو اور یہاں کیا لینے آئے ہو۔ مشکند سٹپٹا گیا۔ کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ دربان سے کیا کہے اور اسے کیسے بتائے کہ وہ اس دیس کا راجہ ہے۔ اسے ایسی غیرت آگئی کہ فوراً ہی پلٹ لیا۔ اور اب جو اس نے ارد گرد نظر ڈالی تو دیکھا کہ سب ہی کے قد چھوٹے ہیں۔ ارد گرد چھوٹے چھوٹے آدمیوں کو دیکھ کر وہ اچنبھے میں پڑ گیا۔ میری راجدھانی میں سب اونچے قد کے لوگ تھے۔ وہ کہاں گئے۔ رفتہ رفتہ طبیعت میں اداسی آگئی۔ لمبا ٹھنڈا سانس بھرا۔ چھوٹے لوگوں کا زمانہ آگیا، بڑبڑایا اور راجدھانی سے نکل گیا۔

مشکند چھوٹے لوگوں کے بیچ سے نکل آیا تھا اور اب بن میں بھٹکتا پھر رہا تھا۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کرے اور کدھر جائے۔ منہ اٹھائے یوں ہی چلا جا رہا تھا کہ جس کھوہ سے سوکر نکلا تھا وہی کھوہ پھر سامنے نظر آنے لگی۔ دل میں کہا کہ کہاں مارے مارے پھر رہے ہو اس گپھا سے بہتر اب تمہارے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔ پھر اسی میں گھس کر سو رہو۔

مشکند کھوہ کی طرف بڑھنے لگا تھا کہ کیا دیکھا کہ سات آدمی کہ ساتھ ان کے ایک کتا تھا لمبے ڈگ بھرتے ہوئے کسی طرف سے آئے اور اس کھوہ میں داخل ہونے لگے۔ مشکند نے بڑھ کر انہیں ٹوکا۔ کہا کہ "مترو یہ گپھا میرا استھان ہے تم یاں کیا لینے آئے ہو"۔

سات میں سے ایک نے سب کی طرف سے جواب دیا" اے عزیز ہم غریب الوطن ہیں۔ فلک کے ستائے ہوئے ہیں' زمانے کے راندے ہوئے ہیں۔ ہماری زمین ہم پر تنگ ہوئی تو سوچا کہ اللہ کی زمین تو کشادہ ہے۔ بس نکل کھڑے ہوئے۔ رنج سفر کھینچ کر یہاں پہنچے ہیں۔ راہ میں یہ غار نظر آیا تو دل نے کہا کہ اسے گوشہ عافیت جانو۔ شاہ دقیانوس کے آدمیوں سے بھی کہ ہمارے پیچھے لگے ہوئے ہیں محفوظ رہیں گے اور تھوڑی کمر بھی لگا لیں کہ خستہ و درماندہ ہیں اور کتنی راتوں کے جاگے ہوئے ہیں"۔

مشکند نے ان کا حال سن کر ترس کھایا۔ بولا" ہے مترو' تمہاری مت ماری گئی تھی کہ تم نے اپنی جنم بھومی چھوڑی۔ سچ ہے کہ دھرتی وشال ہے' پر کٹھور بھی تو ہے بے ٹھکانوں کو بہت ستاتی ہے۔ میری اتنی عمر ہو گئی۔ دیس دیس کی یاترا کی ہے۔ جنم بھومی تیاگنے والے کو میں نے کبھی سپھل ہوتے نہیں دیکھا"۔

"عزیز تو نے سچ کہا۔ مگر ہمارے لئے چارہ کیا تھا۔ بادشاہ جابر تھا۔ حق و صداقت کا دشمن تھا۔ اس فضا میں ہمارے لئے سانس لینا دشوار ہو گیا تھا۔ ایسی گھڑی آئی کہ اپنے بھی پرائے ہو گئے"۔

مشکند نے ٹھنڈا سانس بھرا" کلجگ جو ہوا"۔

"کلجگ؟" ساتوں نے حیران ہو کر پہلے ایک دوسرے کو دیکھا پھر مشکند کا منہ تکنے

گے۔

مشکند کو ان پر اور بھی ترس آیا کہ ان اگیانیوں کو یہ تک پتہ نہیں کہ ترتیا یگ کا انت ہو چکا ہے اور اب کلجگ چل رہا ہے۔ اس نے سوچا کہ انہیں تھوڑی سکشا دینی چاہئے کہ جگوں کا کیا چکر ہے' یہ جگ کونسا ہے اور اس میں کیا کچھ ہونا ہے یہی کچھ کہنے کے لئے ہونٹ کھولنے لگا تھا مگر اس نے دیکھا کہ وہ تو اب وہاں ہیں ہی نہیں۔ حیران ہوا کہ وہ کدھر نکل گئے مگر پھر یہ سوچ کر مطمئن ہو گیا کہ اچھا ہوا وہ کہیں آگے بڑھ گئے۔ اب وہ اپنی گپھا میں جاکر اطمینان سے سو سکے گا۔ مگر جب اس نے کھوہ کی طرف قدم بڑھایا تو دیکھا کہ وہ ساتوں کے ساتوں اندر سوئے پڑے ہیں۔ دل ہی دل میں جھلایا کہ مورکھ میرے استھان پر جاکر سو گئے۔ ایک نکھٹو میرے سنگھاسن پر دھرنا دے کے بیٹھ گیا۔ یہ سات پردیسی میرے بسیرے کے استھان پر آکر پسر گئے۔ میں کہاں جاؤں۔ اس نے طے کیا کہ انہیں اٹھا کر کہا جائے کہ یہاں سے لمبے بنو۔ کسی اور جگہ جاکر ٹھکانا کرو۔

یہ سوچ کر مشکند نے کھوہ کی طرف قدم بڑھایا۔ اچانک کتے نے جھرجھری لی اور اس پر غرانے لگا کہ جیسے اس نے دوسرا قدم بڑھایا تو اس پر جھپٹ پڑے گا۔ کتے کی یہ مجال کہ اس پر غرائے' اسے بہت تاؤ آیا۔ سوچا کہ اسے قہر کی آنکھ سے دیکھو اور بھسم کر دو۔ اس نے اپنی طرف سے یہ کوشش کی مگر اچانک اسے احساس ہوا کہ اس کی آنکھ قہر کی نظر جوگی نہیں رہی۔ اس بات سے وہ بہت پریشان ہوا۔ اسے لگا کہ اس کی ساری طاقت اس کی قہر کی نظر میں تھی وہ نظر گئی تو جیسے اس کی ساری طاقت چلی گئی ہو مگر یہ ہوا کیسے اور اسے سوچتے سوچتے خیال آیا کہ اس نے کہیں پرانوں میں پڑھا تھا کہ ایک ایسا سورما پیدا ہو گا جس کی دھنش کے بان کتنے ہی چلائے جائیں پر ختم نہیں ہوں گے۔ وہ بہت معرکے مارے گا مگر ایک سمے ایسا آئے گا کہ اس کی دھنش کھینچے نہیں کھنچے گی اور اس کے سارے بان ختم ہو چکے ہوں گے۔ تب وہ سوچے گا کہ یہ اس کا انت سمے ہے اور وہ دنیا سے منھ موڑ کر پربتوں میں نکل جائے گا۔ یہ بات دھیان میں آئی تو اس کا جی بیٹھنے لگا۔ ایک اداسی کے ساتھ سوچا کہ سونے سے پہلے دنیا کو اس کی کتنی ضرورت تھی۔ دھرتی کی بات تو جانے ہی

وہ ' اسمانوں پر براجمان دیوتا بھی اس کی مدد کے محتاج تھے۔ دھرتی سے لے کر آکاش تک کتنی مانگ تھی اس کی ۔ سو کر اٹھا ہے تو دنیا کچھ سے کچھ ہو گئی ۔ جیسے زمانے نے اس سے منہ موڑ لیا ہو ' جیسے اب کسی کو اس کی ضرورت نہ رہی ہو۔ یہ سوچتے سوچتے اس نے ایک دفعہ پھر گپھا کے اندر نظر دوڑائی۔ وہ ساتوں آدمی سوئے پڑے تھے اور خراٹے لے رہے تھے۔ کتا دانت نکوس رہا تھا اور غرا رہا تھا ۔ دنیا میں اب ' اس نے سوچا ' میرے لئے کوئی جگہ نہیں ہے ' نہ نگر میں نہ بن میں ' اس خیال کے ساتھ وہ بالکل ہی ڈھے گیا۔ میرا سمے بیت گیا۔ اب دوسروں کے سونے اور جاگنے کا سمے ہے وہ سوچ میں پڑ گیا۔ پھر دھیان کی ایک اور لہر آئی ۔ تو پھر میں کیوں اس اسار سنسار میں بھٹکتا پھر رہا ہوں۔ اور دھیان کی اس لہر نے اسے ایسا اپنی لپیٹ میں لیا کہ بس پھر وہ ہمالہ پربت کے گھنے جنگلوں میں نکل گیا۔ ایک پیڑ تلے سمادھی لگا کر بیٹھا۔ آنکھیں موند لیں۔ لمبا سانس کھینچا کہ دم بند ہوا اور وہ ہمیشہ کے لئے سو گیا۔

❁ = = = = = = = ❁

گونڈوں کا جنگل

"آیا"؟

"نہیں"۔

"گھنٹی کس نے بجائی تھی؟"

"سامنے کے فلیٹ والوں کا نوکر تھا۔ اخبار مانگ رہا تھا"۔

جیسے انہوں نے سنا ہی نہ ہو۔ بڑبڑائیں۔ "جانے کہاں رہ گیا"۔ اپنے فکر مند چہرے کے ساتھ اک ذرا دیر کھڑی رہیں اور پھر الٹے قدموں واپس چلی گئیں۔

"بیٹے مبین"۔ باوا جان بولے "یہ ساجد میاں آئے بیٹھے ہیں۔ ان کے لئے چائے بنواؤ"۔

مبین اٹھنے لگا تھا کہ ساجد نے اسے ٹوکا۔ "ابھی نہیں۔ ہو جائے گی چائے بھی۔ معین کو آجانے دو"۔

"کہیں آئے بھی" باوا جان فکر مندانہ لہجہ میں بولے "دیکھ رہے ہو اس کی ماں کتنی پریشان ہے"۔

اماں نے پھر اپنے پریشان چہرے کے ساتھ کمرے میں جھانکا جیسے انہیں کسی بات کا خیال آگیا ہو۔ "اے بھیا ساجد' اس نے تم سے کیا کہا تھا"۔

"جی اصل میں میں نے اس سے یہ کہا تھا کہ شام کو بہت بوریت ہوتی ہے۔ کہیں نکل

ہی نہیں سکتے - شام ہی کے ساتھ کرفیو کا وقت شروع ہو جاتا ہے - اس نے کہا کہ میں تو آج کل دن میں بھی گھر ہی پر ہوتا ہوں - تم دفتر سے آنے کے بعد ادھر آجانا- رشید سے کہیں گے وہ بھی آجائے گا- رات کو ادھر ہی رہ جاؤ- گپ کریں گے- کوئی اچھی پکچر مل گئی تو وہ بھی دیکھ لیں گے"-

"ہاں کئی دن سے گھر ہی پر تھا- کام تو پٹ پڑا ہے - نکل کے کیا کرے - مگر صبح ہی صبح کوئی فون آگیا- فوراً ہی اٹھ کھڑا ہوا- میں نے کہا کہ بیٹے مت جاؤ- دن خراب ہیں- کہا کہ کام نکل آیا ہے - ابھی نبٹا کر ایک ڈیڑھ گھنٹے میں آرہا ہوں- اچھا ابھی آرہا ہے - اب دن ڈھل رہا ہے اور اس کا کہیں اتا پتا نہیں"-

یہ ساری بات انہوں نے کھڑے کھڑے کی اور پھر الٹے قدموں لوٹ گئیں- ساجد کے بیٹھے بیٹھے ان کا کمرے میں یہ چوتھا پھیرا تھا- اور ساجد کو آتے ہوئے کونسی ایسی دیر ہوئی تھی- ابھی تو باوا جان نے حالات حاضرہ پر اپنا تبصرہ بھی شروع نہیں کیا تھا-

فون کی گھنٹی بجی- مبین نے جاکر اٹھایا- "ہیلو .... جی ...... جی ابھی نہیں آئے"-

اماں لپک کر آئیں- "معین کو پوچھ رہا ہے- اس سے ذرا پوچھ تو سہی کہ...."

"کیا پوچھنا تھا- ہو گا کوئی"-

"کس بے پروائی سے کہہ دیا کہ ہو گا کوئی- پتہ نہیں کون ہے- صبح بھی اس کے جانے کے تھوڑی دیر بعد فون آیا تھا- پھر دوپہر کو آیا اور اب پھر آگیا- پوچھتا ہے اور فوراً بند کر دیتا ہے - جانے کون ہے - کوئی بھیدی ہے یا کوئی ...." کہتے کہتے چپ ہو گئیں اور ساتھ ہی کمرے سے نکل گئیں-

ان کے جانے کے بعد باوا جان نے زبان کھولی- "تم تو باہر نکلتے ہو- شہر میں آج تو خیریت رہی یا کچھ...."

"سنا تو نہیں- اگر کچھ ہوا ہو گا تو کل کے اخبار ہی سے پتہ چلے گا"-

"ہاں کل کے اخبار ہی سے پتہ چلے گا- پہلے تو شہر میں ذرا سی بات ہو جاتی تو دم کے دم میں پورے شہر میں پھیل جاتی تھی- اب یہ حال ہے کہ ایک علاقہ میں قیامت گذر

جائے' دوسرے علاقوں کو پتہ ہی نہیں چلتا۔ ابھی پچھلے جمعہ کی بات ہے۔ ہم ولیمہ کھا رہے تھے۔ ادھر شادی گھر سے چار قدم پر دوسرا علاقہ لگتا تھا۔ وہاں گولی چل گئی۔ پولیس پہنچ گئی۔ کرفیو لگ گیا اور ادھر پتہ ہی نہیں۔ ہم ولیمہ کھاتے رہے"۔

"لیکن سید صاحب' افواہ تو بہت جلد پھیل جاتی ہے"۔

"ہاں یہ بھی تم سچ کہو ہو۔ میاں حالات بہت خراب ہیں۔ میں تو ان دونوں لڑکوں سے یہی کہتا ہوں کہ گھومنا پھرنا بند کرو۔ معین کے پاؤں میں چکر ہے۔ اسے خاص طور پر تنبیہہ کرتا ہوں کہ بیٹے اب وہ زمانہ نہیں رہا کہ دن رات شہر کی خاک پھانکتے پھرو۔ اب تو یہ ہے کہ ضروری کام کرو اور الٹے پاؤں گھر آجاؤ۔ مگر وہ سنتا کہاں ہے۔ اب تم دیکھ رہے ہو کہ اس کی ماں کا کیا حال ہے"۔

فون کی گھنٹی بجی۔ بابا جان بولتے بولتے رکے۔ "مبین بیٹے ذرا دیکھو کس کا فون ہے۔ شاید .... اس کا....."

مبین لپک کر گیا۔ "ہیلو .... اچھا بلاتا ہوں۔" پھر پکار کر کہا۔ "ندیم تمہارا فون۔"

ندیم نے آکر فون سنا۔ چند منٹ بات کی۔ ادھر سے فارغ ہو کر ڈرائنگ روم میں آیا۔

"کتنا اسکور ہوا؟" مبین نے پوچھا۔

"۱۶۳"

"بس؟ بہت سلو جا رہے ہیں"۔

"ان کے بالروں نے ناطقہ بند کر رکھا ہے۔ اتنی دیر ہو گئی۔ کوئی چوکا نہیں لگا"۔

"ہار تو نہیں جائیں گے؟"

"دیکھو کیا ہوتا ہے"۔ کہتے کہتے کمرے سے نکل گیا۔

اماں اب گم سم کھڑی تھیں۔ ساجد کی بات کا بھی کوئی رد عمل نہیں ہوا۔ اپنا اس طرح کھڑا رہنا خود ہی عجب سا لگا۔ خاموشی سے باہر نکل گئیں۔

کمرے میں تھوڑی دیر خاموشی رہی۔ پھر مبین بڑبڑایا۔ "بھائی جان کو پتہ ہے کہ اماں

ذرا سی بات پر گھبرا جاتی ہیں۔ خود بھی پریشان ہوتی ہیں ' ہمیں بھی پریشان کرتی ہیں۔ مگر بھائی جان ہیں کہ....."

"بیٹے ' پریشانی کی بات تو ہے۔ یہ تو وہ زمانہ ہے کہ گھر سے باہر قدم نکالتے ہوئے دل ڈرتا ہے"۔

"سید صاحب"۔ ساجد بولا۔" باہر اور اندر سے کیا فرق پڑتا ہے۔ آدمی اندر کونسا محفوظ ہے"۔

"ٹھیک کہہ رہے ہو میاں۔ بس بری گھڑی سے ڈرنا چاہئے۔" رکے پھر بولے " ایک بات میں تمہیں بتاؤں۔ پہلے میں بالکل نہیں ڈرتا تھا۔ میرے بیٹے میں نے فارسٹ میں نوکری کی ہے۔ اس وقت میری عمر ہی کیا تھی۔ میٹرک کرتے ہی نوکری میں جت گیا۔ ہمارے پھوپھا صاحب فارسٹ میں کنزرویٹر تھے۔ مجھے انہوں نے اپنے محکمہ میں لگوا دیا۔ سی پی میں میری تعیناتی ہوئی۔ وہاں کے جنگل الاماں۔ دن میں رات کا سماں ہوتا تھا اور رات میں یہ حالت کہ میلوں چلتے چلے جاؤ۔ روشنی کا نام نشان نہیں۔ آدمی کا اتا پتا نہیں۔ ایک میں ' ایک میرا اردلی۔ میرے پاس ایک بندوق ' کارتوسوں کی ایک پیٹی اردلی کے ایک ہاتھ میں لالٹین ' دوسرے میں لاٹھی۔ وہاں گونڈوں سے سابقہ تھا۔ جنگلی لوگ تھے۔ سخت خطرناک۔ رات کو لکڑی چراتے تھے۔ فارسٹ والے انہیں چیک کرتے ہوئے گھبراتے تھے۔ جان کس کو پیاری نہیں ہوتی۔ مگر میرے ہتھے جو چڑھ گیا میں نے اسے نہیں چھوڑا۔ چھٹی پر گھر آیا تو تایا جان کہنے لگے بیٹے تمہارے پھوپھا نے تمہیں کہاں جھونک دیا۔ وہ تو سارا ہندوؤں کا علاقہ ہے۔ اوپر سے گونڈ بھیل اور تمہاری جنگل کی نوکری۔ تمہیں ڈر نہیں لگتا۔ میں نے کہا کہ نہیں۔ واقعی ان دنوں مجھے ڈر نہیں لگتا تھا۔ اس کے باوجود کہ میں وہاں اکیلا مسلمان تھا۔ یقین جانو بالکل ڈر نہیں لگتا تھا۔ مگر اب لگتا ہے...... اور مسلمانوں سے۔" چپ ہوئے ٹھنڈا سانس بھرا۔" کیا زمانہ آیا ہے ' مسلمان مسلمان سے ڈرتا ہے"۔

"سید صاحب"۔ ساجد پوچھنے لگا۔" سی پی تو ساؤتھ میں ہے نا"۔

"یہی سمجھ لو۔ مگر میاں ہمیں تو کبھی پتہ چلا نہیں کہ شمال کدھر ہے اور جنوب کدھر ہے

ہم کس سمت میں ہیں اور کس سمت میں جا رہے ہیں - جنگل میں سمت کا احساس نہیں ہوتا جنگل سا جنگل - شیر ' چیتے ' تیندوے اور آدمی کے نام گونڈیا بھیل- وہ ان سے زیادہ جنگلی- اب سوچتا ہوں تو حیرت ہوتی ہے کہ کس طرح میں بے دھڑک گشت کرتا تھا- بس اوپر اللہ کا سہارا تھا اور نیچے اپنے کاندھے پہ رکھی بندوق کا - میاں اس بندوق نے میرا بہت ساتھ دیا- گونڈوں کو پتہ تھا کہ میرے پاس بندوق ہے- فسادات کے دنوں میں اسی بندوق نے ہمارے محلّے کو بچایا- ایک ہمارا ہی محلّہ تھا جس پہ حملہ نہیں ہوا- انہیں پتہ تھا کہ اس محلّے میں ایک گھر بندوق والا ہے"- پھر ٹھنڈا سانس بھرا-" افسوس کہ ادھر ہی رہ گئی - اب تو میاں ہم نہتے ہیں- پھر ڈرنا ہی ہوا"-

"باوا جان" مبین بولا" آپ کی بندوق اس وقت کیا کام آتی- بندوق تو اب طمنچہ لگتی ہے"-

"سن رہے ہو- میاں ساجد- جب میں اپنی بندوق کی بات کرتا ہوں تو یہ لڑکے ہنستے ہیں- کہتے ہیں کہ یہ کلاشنکوف کا زمانہ ہے- ویسے تو یہ بات ٹھیک ہی ہے - مگر میاں بندوق پھر بندوق ہے"-

ندیم نے اندر جھانکا -" بھائی جان نہیں آئے؟"

"نہیں"- مبین نے مختصر جواب دیا-

"کہاں رہ گئے - اماں پریشان ہو رہی ہیں"-

"اللہ جانے کہاں رہ گئے- انہیں یہ تو سوچنا چاہئے تھا کہ اماں کتنی پریشان ہوں گی"-رک کر-" میچ اب کیسا جا رہا ہے"-

"کھیل میں اب تیزی آئی ہے- ابھی تک ففٹی ففٹی کا معاملہ ہے - چائے کے وقفہ کے بعد دیکھو 'کیا نقشہ نکلتا ہے -" چونک کر " وقفہ ختم ہو گیا-" تیزی سے نکل جاتا ہے-

باوا جان نے اطمینان کا سانس لیا- اس وقت اس کا آنا انہیں اچھا نہیں لگا تھا-

"ساجد میاں دیکھ رہے ہو- آج کل کے لڑکے اس کھیل کے پیچھے کیسے دیوانے ہو رہے ہیں- اتنا تو ہم نے پتنگ کے پیچھے بھی لڑکوں کو دیوانہ ہوتے نہیں دیکھا تھا"-

"ہاں آج کل کرکٹ کا بہت کریز ہے"۔ ساجد نے مختصراً کہا۔

"میاں یہ سب قدرت کے کھیل ہیں۔ آگے تلوار مرد کی زینت سمجھی جاتی تھی۔ اب بلا ہے۔ ساجد میاں انصاف کی کہنا تمہارا نیا زمانہ تلوار کا ابھی تک کوئی جواب نہیں لا سکا۔ یہ تمہارے نئے ہتھیار تو مشینیں ہیں۔ بٹن دبایا، مشین چل گئی۔ اور بٹن کا کیا ہے اسے کوئی بھی دبا دے، مرد کی قید تو نہیں ہے۔ مگر تلوار ....."

دروازے کی گھنٹی کی آواز سے فقرہ بیچ کے بیچ ہی میں رہ گیا۔ "مبین جاؤ۔ دیکھو۔ شاید...."

مبین دروازے کی طرف گیا۔ اماں لپکی ہوئی آئیں۔ "گھنٹی بجی تھی"؟

"ہاں"۔ باوا جان نے تحمل کے ساتھ کہا۔ "دروازے پہ کوئی ہے"؟

"اور کون ہوتا۔ میں جانوں کہ وہ ....." یہ کہتے ہوئے وہ مڑ کر دروازے کی طرف جانے لگی تھیں کہ اتنے میں مبین واپس آ گیا۔

"کون تھا؟" اماں اور باوا جان نے بیک وقت پوچھا۔

"اوپر کے فلیٹ والے"۔

"اوپر کے فلیٹ والے؟"۔ جیسے باوا جان یہ اندازہ لگانے سے قاصر ہوں کہ آنے والا کون تھا۔

"وہ جو نمبر تریسٹھ میں رہتے ہیں۔"

"کیا کہتے تھے؟"

"بھائی جان کو پوچھ رہے تھے"۔

"کیوں؟"

"یہ انہوں نے نہیں بتایا"۔

"تو بیٹا تو ان سے پوچھتا کہ تم کیوں پوچھ رہے ہو، کیا کام ہے"۔

"ہم تو انہیں جانتے نہیں۔ کون صاحب ہیں۔ کیا کرتے ہیں؟"

"وکیل ہیں"۔

"وکیل"۔ باوا جان نے معنی خیز انداز میں کہا۔

"ارے پہلے تو یہ کبھی ہمارے معین کو پوچھنے آئے نہیں۔ اور میں تو جانوں معین انہیں جانتا بھی نہیں ہے"۔

"میاں ساجد، تم انہیں جانتے ہو؟"

"نہیں"۔

"کمال بات ہے۔ نہ تم انہیں جانتے ہو نہ ہم انہیں جانتے ہیں"۔

"اصل میں"۔ ساجد نے وضاحت کی "میں تو فلیٹ والوں سے زیادہ ملتا جلتا نہیں"۔

"میاں ہم کونسے ان سے ملتے جلتے ہیں۔ ایک تمہارے سوا ہم تو نہیں جانتے کہ کون یہاں رہتا ہے اور کیا کرتا ہے"۔

"مگر یہ مُنا وکیل ہمارے گھر کیوں آیا تھا اور کیوں پوچھ رہا تھا معین کو"۔

"اماں، مجھے تو وکیل شریف آدمی لگتا تھا۔ آپ خواہ مخواہ شک کر رہی ہیں"۔

"تیرا کیا ہے تو تو ہر اٹھائی گیرے کو شریف آدمی کہہ دیتا ہے"۔

"عجب زمانہ آیا ہے"۔ باوا جان بولے" آدمی آدمی سے خائف ہے۔ اور پڑوسی پڑوسی پر اعتبار نہیں کرتا۔ اور کیسے کرے۔ ہر طرح کا آدم شہر میں آکر بس گیا ہے۔ اب انہیں فلیٹوں کو لے لو۔ رنگ رنگ کا آدمی آباد ہے۔ اور سب اجنبی۔ کیا خبر کون کیا ہے۔ اسی لئے کوئی کسی کے درد میں شریک نہیں ہے ورنہ ہمسایوں سے زیادہ دکھ درد کا شریک اور کون ہوتا تھا۔ اب ہم کس کے سامنے جا کے روئیں کہ ہمارا بیٹا صبح کا نکلا ہوا ہے اور پتہ نہیں کہ کس مصیبت میں گرفتار ہے کہ ابھی تک واپس نہیں آیا"۔

اماں جو اپنی بات کہہ کر گہری فکر میں ڈوب گئی تھیں اچانک اٹھیں اور کمرے سے نکل گئیں۔

"باوا جان"۔

"ہوں"۔

"اب تو واقعی فکر کی بات ہے۔ کرفیو کا وقت قریب آچلا ہے اور بھائی جان....."

"ہوں .... پھر بیٹے بتاؤ ہم کیا کریں"۔ باوا جان نے فکر مندی سے کہا۔

"کس سے پوچھا جائے۔" مبین جیسے سوچ رہا ہو کہ کس سے رابطہ قائم کر کے معلوم کیا جائے۔

"اب تو واقعی معین کو آجانا چاہئے"۔ ساجد بولا۔" سمجھ میں بات نہیں آئی کہ کیوں ابھی تک نہیں آیا جبکہ اس نے مجھے وقت بھی دے رکھا تھا۔ رشید کو بھی آنا تھا وہ بھی نہیں آیا۔ شاید اسی کے ساتھ آئے اور شاید اسی کی وجہ سے دیر ہوئی ہو"۔

"اس لڑکے نے پریشان کر دیا"۔ باوا جان اب بہت فکر مند نظر آرہے تھے۔"آج صبح جانے ہم نے کس کا منہ دیکھا تھا۔ سارا دن پریشانی میں گذر گیا۔ پہلے بھائی بشارت کے خط نے پریشان کیا۔ ساجد میاں ' ہمارے بھائی بشارت ادھر نہیں آئے تھے ' ادھر ہی ہیں۔ انہوں نے خورجہ کا احوال لکھا ہے ۔ بہت خراب حالات ہیں۔ اور وہ سمجھ رہے ہیں کہ پاکستان میں لوگ بہت آرام سے ہیں"۔

"ہاں آج کل تو وہاں قیامت اٹھی ہوئی ہے"۔ ساجد بولا۔

"میاں پہلے مجھے بہت غصہ آتا تھا' ہندوؤں پر ' سکھوں پر یہودیوں پر ' یہودیوں نے کم ظلم کئے ہیں مسلمانوں پر' تو مجھے بہت غصہ آتا تھا ۔ اب نہیں آتا۔ شاید اس لئے کہ بوڑھا ہو گیا ہوں یا شاید اس لئے کہ اتنا کچھ دیکھا ہے کہ ...... بس مت پوچھو۔ تو غصہ آگے آتا تھا ۔ اب نہیں آتا..... کسی بھی بات ...... آتا بھی ہے تو خود اپنے آپ پر"۔

"ہاں حالات ہی ایسے ہیں"۔

"نہیں ساجد میاں یہ بات نہیں ہے ۔ بات یہ ہے کہ درد مندی ختم ہو گئی۔ ہمارے والد کا خدا انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔ یہ حال تھا کہ ایک دفعہ ' شکوہ جواب شکوہ ' پڑھنے بیٹھے تو اتنا روئے کہ ہڑکی بندھ گئی ۔ تو درد مندی تو ان لوگوں کے ساتھ چلی گئی۔ اور ساتھ میں مسلمانی بھی"۔

ندیم گھبرایا ہوا داخل ہوا۔" مبین بھائی اماں دروازے پہ کھڑی ہیں۔ انہیں جا کے سنبھالو۔ میچ آخری دموں پر ہے۔ میں ابھی آیا۔ بہت پریشان کیا ہے بھائی جان نے"۔ اور

فوراً ہی واپس ہو لیا۔

مبین لپک کر دروازے کی طرف گیا - باوا جان کی زبان کو جیسے تالا لگ گیا ہو۔ مبین پکڑ دھکڑ کر اماں کو واپس لایا اور صوفے پر بٹھا دیا۔" اماں آپ اتنا تو مت گھبرائیں۔ ممکن ہے کوئی مصروفیت نکل آئی ہو۔ آجائیں گے"۔

"آنا ہوتا تو آجاتا"۔ اماں نے جیسے اب امید کا دامن چھوڑ دیا ہو۔" اب کب آئے گا۔ کرفیو کا وقت شروع ہو گیا"۔

"ابھی نہیں شروع ہوا ہے"۔ مبین نے ان کی تصحیح کی

"اب وہ نہیں آئے گا"۔ اور اماں نے سسکیاں لینی شروع کر دیں۔

باوا جان خاموش دیکھتے رہے۔ پھر مبین سے مخاطب ہوئے۔" بیٹے، انہیں اندر لے جاؤ"۔

مبین انہیں سمجھانے بجھانے لگا۔ انہوں نے آنسو پونچھے۔ بالکل چپ ہو گئیں۔

"چلیں، اندر چلیں آپ"۔

وہ اٹھ کھڑی ہوئیں اور خاموشی سے نکل گئیں۔ مبین ان کے پیچھے پیچھے گیا۔

"پاکستان جیت گیا"۔ ندیم نے اندر قدم رکھتے ہوئے اعلان کیا۔

"اچھا؟" ساجد نے بے ساختہ کہا۔" ہار جاتا تو بہت کرکری ہوتی"۔

"آخری وقت تک کچھ پتہ نہیں چل رہا تھا کہ کیا ہو گا۔ بس آخری بال نے فیصلہ کیا۔ چوکا نہ لگتا تو رہ گئے تھے"۔

"چلو عزت رہ گئی"۔ ساجد اس جیت پر کتنا مطمئن نظر آرہا تھا۔ مگر اس اطمینان میں ندیم والی گرم جوشی نہیں تھی۔

"اب تو فارغ ہو گئے ہو - جا کے ماں کی خبر لو"۔

"تو بھائی جان ابھی نہیں آئے؟...... حد ہو گئی...... کہاں رہ گئے"۔ کہا اور کمرے سے نکل گیا۔

"کیا وقت ہو گیا؟" باوا جان ساجد سے مخاطب ہوئے۔

"کرفیو شروع ہو چکا ہے"۔ ساجد نے کلائی پر لگی گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔

باوا جان نے تامل کیا۔ پھر بڑبڑائے "ضرور کچھ ....." فقرہ بیچ ہی میں چھوڑ کر چپ ہو گئے۔

"سمجھ میں نہیں آیا"۔

"اب سمجھ میں نہ آنے والی کونسی بات رہ گئی ہے"۔

ایک تھوڑے تامل کے بعد۔ "پھر میں چلوں؟"

"ٹھیک ہے۔ تم نے بہت انتظار کیا۔ اب ....." پھر کچھ کہتے کہتے رک گئے۔ ساجد کھڑا ہونے لگا تھا کہ دروازے کی گھنٹی بجی۔ ساجد ٹھٹھکا۔ "میرے خیال میں وہ آگیا"۔

"وہ ..... وہ اب کیا آئے گا"۔

انہوں نے دیکھا کہ مبین اور ندیم دونوں تیزی سے دروازے کی طرف گئے ہیں۔ دونوں دم سادھے بیٹھے رہے۔ وہ پلٹے تو واقعی معین ان کے ساتھ تھا۔ باوا جان نے ملامت آمیز نظروں سے اسے دیکھا۔

"ارے ساجد تم بیٹھے ہو۔ کیا بتاؤں....."

"ہمیں بعد میں بتانا"۔ باوا جان نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "پہلے اپنی ماں کو جا کر بتاؤ"۔

"ٹھیک ہے۔ ساجد تم بیٹھے ہونا۔ میں ابھی آیا"۔ اس کے چہرے پہ ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

"اللہ نے بڑا کرم کیا"۔ ساجد نے معین کے جانے کے بعد تھوڑے توقف کے بعد کہا۔ "ہم تو سمجھے تھے کہ ...." خاموش ہو گیا۔

باوا جان کا ذہن جانے کہاں تھا۔ گم بیٹھے تھے۔ ساجد پھر شروع ہو گیا۔ "یہاں تو کسی وقت کا کوئی اعتبار ہی نہیں ہے۔ فساد کی بات تو الگ ہے۔ یوں آپ چلے جا رہے ہیں۔ بازار میں گہما گہمی ہے۔ گولی کسی سمت سے آئی۔ آدمی ختم۔ یا چلتے چلتے آپ اٹھا لئے جائیں۔ یعنی آپکے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا ہے"۔

"ہاں"۔ باوا جان نے ٹھنڈا سانس لیا۔" کہنا تو نہیں چاہئے میاں ساجد لیکن بات منہ پر آگئی ہے تو کہنا ہی پڑتا ہے۔ پاکستان .... ہار گیا"۔

ندیم مٹھائی کا ڈبہ لئے داخل ہوا" ساجد بھائی ' مٹھائی کھایئے"۔

"مٹھائی؟ اچھا...... بھئی خوب۔ مگر کس بات کی؟"

"پاکستان کے جیتنے کی خوشی میں"۔ پھر باوا جان کی طرف ڈبہ بڑھایا۔" باوا جان آپ بھی کچھ لیجئے"۔

"نہیں بیٹے ' تمہیں پتہ ہے کہ میرا میٹھے سے پرہیز ہے"۔

ندیم جس تیزی سے آیا تھا اسی تیزی سے واپس چلا گیا۔

باوا جان کا ذہن وہیں اٹکا ہوا تھا ۔ کسی سے مخاطب نہیں تھے۔ اپنے آپ ہی بڑ بڑا رہے تھے"۔ عجیب بات ہے ۔ لڑا بھی نہیں اور ہار گیا۔..... بس اپنے آپ ہی سے ہار گیا"۔

معین داخل ہوا۔ اس کے چہرے سے پریشانی کے اثرات ابھی گئے نہیں تھے۔ آکر خاموش بیٹھ گیا۔ پیچھے پیچھے چائے بھی آگئی۔" ساجد ' چائے پیو۔ یار تمہیں بہت انتظار کرنا پڑا"۔

باوا جان اٹھ کھڑے ہوئے ۔" لو اب تم لوگ باتیں کرو۔ میں چلا"۔

"سید صاحب ' چائے آگئی ہے۔ آپ ہمارے ساتھ چائے نہیں پئیں گے؟"

"نہیں میاں میری نماز کا وقت ہو رہا ہے"۔

"یار ساجد ' سوری"

"مگر یار ' تم نے سارے گھر کو پریشان کر دیا۔ آخر ہوا کیا تھا"؟

"بتاؤں گا۔ تم چائے پیو"۔

"تم مجھے نارمل نظر نہیں آرہے ۔ کچھ ہوا ہے؟"

"کچھ نہیں ۔ یار چائے لونا۔ ٹھنڈی ہو جائے گی۔

ساجد نے غور سے اس کے چہرے کو دیکھا اور پھر چائے پینے لگا ۔ وہ زیادہ باتیں کرنے

کے موڈ میں نہیں تھا، جیسے اس سارے قصے نے اسے تھکا دیا ہو اور معین تو تھا ہی سارے دن کا تھکا ہوا۔

"میرے خیال میں تم آج خاصے بور ہوئے ہو۔ باوا جان نے بہت بور کیا ہو گا"۔

"بالکل نہیں۔ میں تو ان کی باتوں سے بہت متاثر ہوا۔ اور ہاں"۔ جیسے اسے اچانک یاد آیا ہو۔ "رشید کو بھی تو تمہارے ساتھ آنا تھا۔ آیا نہیں"۔

معین نے تامل کیا۔ پھر بولا۔ "نہیں..... "توقف کیا۔ پھر ڈھئی ہوئی آواز میں بولا۔ "اب وہ نہیں آئے گا"۔

"ہاں اب کیا آئے گا۔ آنا ہوتا تو آچکا ہوتا۔ کیوں، تمہیں ملا نہیں تھا"۔

"ملا تھا.... ہم ساتھ ہی تھے"۔

"پھر؟"

ندیم خوش خوش داخل ہوا۔ "ساجد بھائی، جیتنے کی خوشی میں ایک پکچر نہ ہو جائے۔ کیا خیال ہے۔ بھائی جان، آپ کہہ بھی رہے تھے۔ تو لگاؤں؟"

"پکچر؟ معین جیسے سٹپٹا گیا ہو۔ "ساجد؟"

"نہیں یار۔ آج نہیں۔ تم بھی سارے دن کے تھکے ہوئے ہو اور میرا بھی اب پکچر دیکھنے کا کچھ موڈ نہیں ہے اور پھر رشید نے نہ آکر سارا موڈ خراب کر دیا"۔

"رشید" معین بڑبڑایا۔ "عجب بات ہے...... آدمی ابھی ہے اور ......ابھی نہیں ہے"۔

ساجد نے معین کو غور سے دیکھا۔ معین جیسے کہیں اور ہو" عجب بات ہے...."

"تم نے بتایا نہیں"۔

"ساجد بھائی" مبین نے آکر اطلاع دی۔ "آپ کے گھر سے فون آیا ہے کہ کتنی دیر میں واپس آرہے ہیں"۔

"کہہ کر نہیں آئے تھے؟" معین نے پوچھا۔

"کہہ کر آیا تھا۔ مگر ہماری امی کو پریشان ہونے کی عادت ہے"۔

"میں نے انہیں بتا دیا" مبین بولا "کہ ہم جیتنے کی خوشی منا رہے ہیں - ابھی پکچر چلے گی- تو انہیں ذرا دیر ہو جائے گی"-

"نہیں بھئی ' آج نہیں"- فوراً ہی اٹھ کھڑا ہوا" پھر کسی دن"-

معین نے بھی اسے نہیں روکا" ہاں ٹھیک ہے- پھر کسی دن"-

ساجد رخصت ہو کر اپنے فلیٹ کی طرف چلا- اپنے کمرے میں داخل ہو کر کرسی پہ ڈھیر ہو گیا جیسے دور سے چل کر آیا ہو- فوراً ہی امی بھی آگئیں "آگئے- اچھا کیا- میں پریشان ہو رہی تھی- فون کیا تو ادھر سے مبین بولا کہ ہم تو ابھی خوشی منا رہے ہیں- میں نے پوچھا کہ بیٹا کس بات کی خوشی منا رہے ہو- کہا کہ جیتنے کی خوشی- اے کون جیت گیا' میں نے پوچھا- کہا کہ پاکستان .... پاکستان- اور بیٹے ہارا کون - اے لو ٹیلی فون ہی کٹ گیا..... اچھا آرام کرو- میں چلی - چائے بھجواؤں-"

"نہیں' پی کر آیا ہوں"-

باہر سے سیٹیوں کی آواز آئی-" آج سیٹیاں بہت بج رہی ہیں"- تشویش بھرے لہجہ میں کہا اور چلی گئیں-

اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگا- سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کرے- کتابوں کو الٹا پلٹا- میز پر جو کتابیں بکھری پڑی تھیں انہیں سلیقہ سے رکھا- فالتو کاغذات پھاڑ کر ردی کی ٹوکری میں ڈالے اس کے بعد سمجھ میں نہ آیا کہ اب کیا کرنا چاہئے- ایک مرتبہ پھر کہیں دور سے سیٹیوں کی آواز آئی- کمرے سے نکل کر بالکنی میں آکر کھڑا ہو گیا- تیسری منزل کے اس فلیٹ کی بالکنی سے یوں لگتا تھا کہ سارا شہر سامنے بچھا ہوا ہے- رات کے اوقات روشنیوں میں جگمگاتا کتنا خوب نظر آتا تھا- آج شکل تھوڑی مختلف تھی- روشنیاں جہاں تہاں اور کچھ پھیکی پھیکی ' سوئی سوئی- عین نیچے اپنی سڑک پر نظر ڈالی- کتنی مصروف سڑک تھی اور اب سائیں سائیں کر رہی تھی- پھر پولیس سے بھری کئی جیپیں تیزی سے گذریں- خاموشی میں گھڑی بھر کے لئے خلل پڑا- پھر وہی ہو حق-" جیتنے کی خوشی میں" ندیم کا کہا ہوا جملہ ایک بے تکے پن سے بلاوجہ اس کے ذہن میں گونجا اور وہ اندر آگیا- واپس کمرے میں آکر بالکنی

میں کھلنے والا دروازہ اور سڑک پر کھلنے والی کھڑکیاں بند کیں اور پھر جب اور کوئی مصروفیت اپنے لئے پیدا نہ کر سکا تو کرسی پر دراز ہو گیا اور آنکھیں موندلیں۔ کتنی انمل بے جوڑ باتیں اس کے تصور میں گھوم گئیں..... ہم کس سمت میں ہیں اور کس سمت میں جا رہے ہیں - جنگل میں سمت کا احساس نہیں ہوتا۔ جنگل سا جنگل۔ خونخوار صورتوں والے نیزوں بھالوں سے مسلح گونڈ اور کالی رات۔ اب وہ نہیں آئے گا۔ واقعی؟ وہ چونکا اور ایک اضطراب میں اٹھ کھڑا ہوا۔ چاہا کہ فوراً معین کو فون کرے۔ اس وقت اس نے ٹھیک طرح سے بات ہی نہیں کی۔ پوچھنا تو چاہئے کہ ..... کہ........ اور فوراً ہی دوسری لہر آئی۔ کیا پوچھنا ہے اور وہ پھر کرسی پر آہستہ سے بیٹھا اور آنکھیں موندلیں - وہ پھر گونڈوں کے جنگل میں تھا۔

❀ = = = = = = = ❀

بندر کہانی

اصل میں یہ سارا واقعہ مہاتما بدھ کی ایک جاتک کتھا سے شروع ہوا۔ یہ جاتک کتھا اس طرح ہے کہ آدمیوں کی دنیا سے بہت دور ایک جنگل میں بندروں کی ایک برادری آباد تھی۔ ان میں سے کسی نے آدمی کی صورت تک نہیں دیکھی تھی۔ اپنی کھال میں مست اور اپنے حال میں مگن پھرتے تھے۔ ان میں ایک بندر تھا جس نے زمانے کا گرم و سرد بہت دیکھا تھا اور جنگلوں میں بھی گھوما پھرا تھا۔ ایک مرتبہ اسے یہ تحقیق کرنے کا خیال آیا کہ جنگلوں سے پرے کیا ہے۔ اس سفر میں اس کا گزر ایک ایسی بستی میں ہوا جس میں آدمی بستے تھے۔ اس سفر سے وہ حیرت اور عبرت کا بہت سامان لے کر واپس ہوا۔ بندر اس کے گرد جمع ہوئے اور سفر کا احوال پوچھنے لگے۔ تب اس نے انہیں بتایا کہ اس نے اس سفر میں ایک نرالی مخلوق دیکھی ہے جو اپنے آپ کو آدمی کہتی ہے دُم ندارد' بال برائے نام' دو قدموں پر چلتی ہے ۔ اس حلیہ والے کا حال احوال سنایا تو انہوں نے کانوں میں انگلیاں دے لیں۔ وہ اٹھ کھڑے ہوئے یہ کہہ کر کہ اب اس جگہ ہم نہیں بیٹھیں گے کہ یہاں ہم نے بدی کی باتیں سنی ہیں اور کان پکڑے کہ آئندہ اس مخلوق کا کبھی نام نہیں لیں گے کہ وہ بد مخلوق ہے۔

جاتک کتھا تو اس بات پر آکر ختم ہو گئی۔ مگر بات ختم نہیں ہوئی۔ بظاہر بندر اس قصے کو بھول بسر گئے۔ لیکن شاید کہیں ان کے اندر ایک پھانس پڑ گئی تھی۔ ایک نوجوان بندر یہ

قصہ سن کر کتنے دنوں بے چین پھرتا پھرا۔ آخر اس سے رہا نہ گیا۔ ایک روز وہ اس بندر کے پاس پہنچا جو آدمی کو جاننے اور پہچاننے کے بعد بندروں کے بیچ عاقل سمجھا جانے لگا تھا۔ پوچھا کہ "اے عاقل' آدمی کس جنگل کا جانور ہے"۔

"جنگل کا جانور" عاقل بندر ہنسا اور بولا "آدمی وہ جانور ہے جو اپنے آپ کو جانوروں سے الگ سمجھتا ہے اور اپنے تئیں اشرف المخلوقات سا بنا ہوا ہے۔ جنگل سے اسے بیر ہے۔ زمین پر آگے کتنے جنگل تھے۔ اس نے کتنے جنگلوں کا ستھراؤ کر دیا۔ جنگل کاٹتا ہے اور اینٹ پتھروں کی عمارتیں کھڑی کر کے ایک ویرانہ تیار کرتا ہے اور اس میں بس جاتا ہے"۔

"درخت کاٹ کر اینٹ پتھروں کی عمارتیں کھڑی کرتا ہے' یہ تو عجب بات ہے"۔

"میاں بندر زادے بات یہ ہے کہ آدمی آسمان سے ڈرتا ہے اور ہوا سے لڑتا ہے۔ دیواریں کھڑی کر کے اور چھتیں پاٹ کر سمجھتا ہے کہ اس نے ان دو دشمنوں سے اپنی حفاظت کا سامان کر لیا ہے"۔

اس گفتگو نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ نوجوان بندر کو کرید تو پہلے ہی تھی کہ آخر یہ آدمی کس قسم کا جانور ہے۔ اب اور بڑھ گئی۔ اسی کرید میں ایک رات پچھلے پہر جب سب بندر سو رہے تھے وہ چپکے سے اٹھا اور وہاں سے سٹک لیا۔

نوجوان بندر کے ہمجولی کئی دن تک اسے ڈھونڈتے پھرے۔ جنگل کا ایک ایک کونہ چھان مارا۔ جب اس کا کوئی پتہ نہ پایا تو یہ سوچ کر صبر کر لیا کہ ان کا دوست کسی درندے کے ہتھے چڑھ گیا' اس نے اسے چیر پھاڑ کھایا۔

دن گذرے' ہفتے گذرے' مہینہ چڑھا۔ جن کے ساتھ وہ نوجوان درختوں پر کودتا پھاندتا پھرا کرتا تھا اب وہ اسے بھول چلے تھے۔ مگر ایک صبح وہ کیا دیکھتے ہیں کہ وہ نوجوان درخت درخت کودتا پھاندتا چلا آرہا ہے۔

نوجوان بندر نے جب یہ بتایا کہ وہ آدمیوں کی دنیا دیکھ کر آرہا ہے تو وہ تو نقش حیرت بن گئے۔ پھر وہ اس کے گرد ایسے اکٹھے ہوئے جیسے وہ ولایت کی سیر کر کے آرہا ہے۔ اس

کی آنکھوں میں حیرت تھی اور ایک نئی دنیا کی دریافت کا سرور۔

"آدمی لوگ کیسے ہوتے ہیں؟" ایک نوخیز بندر نے سوال کیا۔

"بہت کمال کے لوگ ہوتے ہیں"۔

"میرا مطلب ہے کہ ہم بندر لوگوں سے کتنے مختلف ہوتے ہیں"۔ اس پر نوجوان بندر سوچ میں پڑ گیا۔ پھر بولا" شروع میں تو میں یہ سمجھا تھا کہ یہ ہم سے بالکل مختلف مخلوق ہے ۔ تو کتنے دن میں ان کے بیچ ایک اجنبی کی طرح دور دور گھومتا پھرتا رہا۔ وہ آنگن میں تو میں منڈیر پر ۔ اصل میں ان کی بستی میں درخت کم بہت ہی کم تھے ' منڈیریں زیادہ تھیں۔ تو میرا بسیرا زیادہ منڈیروں پر ہوتا تھا۔ مگر جب میں نے انہیں دیکھا بھالا ان کے طور اطوار دیکھے تو اجنبیت دور ہوتی چلی گئی ۔ ایسا لگنے لگا کہ وہ اپنے ہی بھائی بند ہیں کہ دور پار آکر بس گئے ہیں"۔

"مگر سنا ہے کہ ان کے تو دُمیں ہی نہیں ہوتیں"۔ اس پر وہ سارے بندر کھل کھلا کر ہنس پڑے۔ نوجوان بندر نے متانت سے اور کسی قدر معذرتی لہجہ میں کہا" ہاں اتنا ضرور ہے کہ ان کے دُم نہیں ہوتی۔ پہلے مجھے بھی یہ بات عجب لگی تھی۔ میں نے دل میں کہا کہ یہ لوگ عجب جانور ہیں کہ اپنی دُمیں ہی گم کر بیٹھے۔ جس کسی آدمی کو دیکھتا تو اس میں ایک کمی کا احساس ہوتا۔ مگر اب معاملہ الٹ ہے۔ تمہیں دیکھ رہا ہوں تو لگ رہا ہے کہ ہمارے تمہارے ساتھ خواہ مخواہ ایک فالتو چیز لگی ہوئی ہے"۔

اس آخری فقرے پر کچھ بندر سٹپٹائے ' کچھ بندر برہم ہوئے ۔ مگر پھر بات جلدی آئی گئی ہو گئی۔ نوجوان بندر نے ذکر ہی ایسا چھیڑ دیا تھا۔ کہنے لگا "آدمی کی مادہ بہت خوبصورت ہوتی ہے"

"ہماری بندریا سے زیادہ خوبصورت؟" ایک نوخیز بندر نے سوال کیا۔

"ہماری بندریا تو ان کے سامنے پانی بھرے"۔

ان بندروں کے لئے کہ خیر سے سب عالم شباب میں تھے بندریاں پریاں تھیں۔ انہیں اس بات کا کیسے یقین آتا۔ "آخر ان ماداؤں میں ایسی کیا خاص بات ہے۔" ایک نے سوال

کیا۔

"بس دیکھنے کی چیز ہے۔ گوری چٹی، چکنی چپڑی، نرم گرم اور سینہ بس جیسے دودھ بھری دو کٹوریاں۔" اور نوجوان بندر نے عورت کا سراپا کچھ اس رنگینی سے بیان کیا کہ وہ سب مسحور ہو گئے۔

پھر نوجوان بندر نے بیان کرنا شروع کیا کہ آدمی نے کیسی کیسی چیز ایجاد کی ہے۔ کہنے لگا "ایک چیز تو اس نے ایسی ایجاد کی ہے کہ تم دیکھو گے تو عش عش کر اٹھو گے"۔

"وہ کیا چیز ہے؟"

"آئینہ"۔

"آئینہ کیا"؟

کیا بتاؤں کہ آئینہ کیا چیز ہے۔ میں نے پہلی مرتبہ آئینہ دیکھا تو دنگ رہ گیا۔ حیران کہ میں آئینے کے اندر کیسے چلا گیا۔ پھر خیال آیا کہ میں تو آئینے کے باہر ہوں اور آئینہ میرے ہاتھ میں ہے۔ رفتہ رفتہ گتھی سلجھی ۔ کھلا یہ کہ میں ایک نہیں ہوں۔ ایک کے اندر دو ہیں"۔

"کیا مطلب۔ ہم سمجھے نہیں"۔

"جب آئینہ دیکھو گے تو یہ بات سمجھ میں آئے گی۔ ہر بندر کے اندر دو بندر ہوتے ہیں۔ مگر جب تک وہ آئینہ نہیں دیکھتا وہ یہی سمجھتا رہتا ہے کہ وہ ایک بندر ہے۔ تو میں نے آئینہ دیکھ کر یہ جانا کہ میں ایک نہیں ہوں، دو ہوں۔ ایک آئینہ سے باہر ایک آئینہ کے اندر۔" نوجوان بندر رکا، پھر سوچتے ہوئے بولا "کبھی کبھی مجھے خیال آتا ہے کہ اصلی بندر آئینہ کے اندر ہے۔ میں جو آئینہ سے باہر ہوں اس کی نقل ہوں"۔

آئینہ کی بات سن کر تو وہ سارے بندر بالکل ہی مبہوت ہو گئے۔ ایک نوخیز بندر کے سر میں مہم جوئی کا سودا سمایا جوش میں آکر اعلان کیا کہ میں آدمیوں کے دیس جاؤں گا اور آئینہ لے کر آؤں گا۔

جوان بندر نے اسے ٹوکا۔ کہا کہ "جوان، آہستہ بول۔ ہمارے بڑوں کو پتہ چل گیا تو

قیامت مچائیں گے۔ انہیں کب گوارا ہے کہ ہم اس جنگل سے نکلیں اور باہر کی دنیا کا تجربہ حاصل کریں"۔

جوان بندر کی تنبیہہ نے اپنا اثر دکھایا۔ سب نوجوان اپنی اپنی جگہ محتاط ہوگئے۔ یوں ہوتا کہ رات کی تاریکی میں کوئی نوجوان بندر اٹھتا اور چپکے سے سٹک جاتا۔ کتنے ہم جو نوجوان بندر اسی انداز سے اپنے جنگل سے نکلے اور آدمیوں کی دنیا کی خبر لائے۔ وہاں سے آئینہ ہی لے کر نہیں آئے، اور کتنی ہی چیزیں لے کر آئے۔ ایک نوجوان بندر کسی گھر سے ایک لہنگا اور ایک دوپٹہ اچک لایا۔ آکر اپنی بندریا کو تحفہ میں پیش کیا۔ بندریا نے حیرت سے لہنگے اور دوپٹے کو دیکھا اور پوچھا 'یہ کیا ہے۔ نوجوان نے کہا' "جانم' پہنو اوڑھو گی تو جانو گی کہ یہ کیا ہے بس پری بن جاؤ گی۔"

بندریا نے لہنگے کو الٹا پلٹا جب اس کا الٹا سیدھا سمجھ میں نہ آیا تو دانتوں میں لے کر چیرنا شروع کر دیا۔ پورے لہنگے کو لیر لیر کر ڈالا۔ یہی عمل دوپٹے کے ساتھ کیا۔ نوجوان بندر نے اپنے دیئے ہوئے تحفہ کا یہ حال دیکھا تو آگ بگولا ہوگیا۔ ڈنڈے سے اسے خوب پیٹا اور گھر سے نکال دیا۔

ابھی بندروں میں اس واقعہ پر چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں کہ ایک بندریا اغواء ہو گئی۔ پھر یوں ہوا کہ ایک بندر نے اپنی بندریا سے منہ موڑا اور کسی غیر بندریا سے ناجائز تعلقات قائم کر لئے۔ جب اس کی بندریا نے اس پر شور مچایا تو بندر نے اسے طلاق کی دھمکی دے ڈالی۔ بندر طلاق کے لفظ پر بہت چکرائے۔ یہ لفظ پہلی مرتبہ ان کے کان میں پڑا تھا۔ وہ اس کے معنی پوچھنے کے لئے عاقل بندر کے پاس پہنچے۔

عاقل بندر کا وقت اب زیادہ تر مطالعہ میں گزرتا تھا۔ بات یہ تھی کہ جب اس کا آدمیوں کی بستی میں گذر ہوا تھا تو اسے وہاں سب سے عجب چیز جو نظر آئی وہ کتاب تھی۔ ایک دفعہ وہ کتابوں کی ایک دکان میں گھس گیا۔ کتابیں پھاڑتے پھاڑتے اس نے سوچا کہ دیکھوں تو سہی ان کے اندر کیا ہے۔ حیران ہوا کہ اچھا اس بے عقل مخلوق نے ایسی عقل کی باتیں بھی لکھ رکھی ہیں۔ اس نے ایک موٹی سی کتاب اٹھائی اور اسے وہاں سے لے

بھاگا۔ اب وہ دن رات اپنی کتاب کی ورق گردانی کرتا رہتا تھا۔ اس کتاب میں وہ ایسا گم ہوا کہ اسے یہ پتہ ہی نہ چلا کہ بندروں کی دنیا میں کیا اندھیر مچا ہوا ہے۔ طلاق کا لفظ سن کر اس کا ماتھا ٹھنکا "طلاق؟ اس فعل کا بندروں سے کیا تعلق - یہ تو حضرت انسان کی ایجاد ہے۔ انہوں نے ہی یہ لفظ گھڑا ہے۔ تم نے کہاں سے سنا"۔

بندروں نے جب اس عاقل کو بتایا کہ ایک بندر نے اپنی بندریا کو طلاق کی دھمکی دی ہے اور اسی کے ساتھ اغوا اور ناجائز تعلقات کی' اور ایک بندریا کے لنگا نہ پہننے اور اس کی پاداش میں اپنے بندر کے ہاتھوں اپنے گھر سے نکالے جانے کے قصے تھضئے سنائے تو اس عاقل نے تو اپنا ماتھا پیٹ لیا" یہ تم مجھے کیا سنا رہے ہو۔ یہ تو سب آدمیوں کے لچھن ہیں۔ بندروں کے اخلاق میں یہ فساد کیسے پیدا ہوا۔ کیا کوئی آدمی ہمارے جنگل میں گھس آیا ہے اور بندروں کے اخلاق کو خراب کر رہا ہے یا کوئی بندر آدمیوں کے دیس کا پھیرا لگا آیا ہے کہ خود تو گمراہ ہوا تھا اب دوسرے بندوروں کو گمراہ کر رہا ہے"۔

بندروں نے کہا کہ "اے عاقل' آدمی کی کیا مجال کہ ہمارے جنگل میں قدم رکھے۔ کوئی آوارہ بندر اگر آدمیوں کے دیس کا چوری چھپے پھیرا لگا آیا ہے تو ہم کہہ نہیں سکتے"۔

بہت سوچ بچار کے بعد ایک بندر سبھا منعقد کی گئی - عاقل بندر مسند صدارت پر بیٹھا اور بندروں سے یوں مخاطب ہوا کہ اے میرے ہم جنسو' عزیز بندرو' میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ بندوں کے اخلاق خراب ہوتے جا رہے ہیں۔ مجھے یہ سن گن ملی ہے کہ چند سر پھرے نوجوان بندر جوش آوارگی میں آدمیوں کے دیس میں جا نکلے۔ اب واپس آئے ہیں تو ان کے اندر آدمیوں کی بو بھری ہوئی ہے۔ اپنی تہذیب سے نالاں ہیں۔ بدیشی تہذیب کے سحر میں ہیں۔ بے حیائی اور بے غیرتی کی حد ہو گئی کہ ایک بندر نے اس تہذیب سے مانگے تانگے کا لباس اپنی گھروالی کو پہنانے کی کوشش کی۔ اور جب اس غیرت والی نے اور حیا کی پتلی نے وہ بے شرمی کا لباس پہننے سے انکار کیا تو اس ننگ خاندان ننگ قوم نے گھروالی کو زدوکوب کیا اور گھر سے نکال دیا۔ مگر کس گھر سے۔ اس گھر کی حقیقت میں آگے بیان کروں گا۔ اے بندرو اب جو میں کہتا ہوں اسے گوش ہوش سے سنو۔ ہم بندر لوگوں کا اپنا ایک

تمدن ' اپنا ایک کلچر ہے اس تمدن ' اس کلچر کی اپنی ایک تاریخ ہے ہم بندر لوگ فطرت کی گود میں پلے ہیں- موسموں نے ہمیں لوریاں دی ہیں- درختوں نے ہمیں جھولا جھلایا ہے- ہواؤں نے ہمیں تھپک تھپک کر سلایا ہے اور گد گدیاں کر کے جگایا ہے- ہم نے اپنے تحفظ کے لئے گرمی سردی سے ' آندھی برسات سے بچنے کے لئے ' آرام و آسائش کے لئے ذائقے اور مزے کے لئے کبھی کوئی مصنوعی طریقہ اختیار نہیں کیا- جیسا قدرت نے ہمیں بنایا ویسے ہم پہلے بھی تھے- آج بھی ہیں اور آئندہ بھی رہنا چاہتے ہیں- اپنے بال ہمیں برے نہیں لگتے اور اپنے بدن سے ہم خائف نہیں- یہ بال ہی ہمارا فطری لباس ہیں- مطلب یہ کہ ہم ننگے نہیں ہیں- اس لئے اپنے بدن سے ہمیں حجاب نہیں آتا اور مصنوعی کپڑے پہننے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی- ادھر عالم یہ ہے کہ کچھ بال ان کے اعمال کی وجہ سے اڑ گئے - باقی جو رہ گئے ہیں وہ انہیں استرے سے مونڈھ ڈالتے ہیں- اب تم پوچھو گے کہ یہ استرا کیا شے ہے- اے عزیزو میں ڈرتا ہوں اس دن سے جب کسی بندر کے ہاتھ میں استرا آجائے- وہ ہمارے تمدن کا آخری دن ہو گا-

"ویسے تو اس ستم ایجاد انسان نے کیا کچھ ایجاد نہیں کیا- مگر اس کی سب سے زیادہ مہلک ایجادات دو ہیں ' آئینہ اور استرا- عزیز بندرو کیا تم یقین کرو گے کہ جب میں نے پہلی مرتبہ آئینہ دیکھا تو میں سکتہ میں آگیا - مجھے عجب گمان ہوا کہ یہ حقیر فقیر بندر جو آئینہ کے روبرو بیٹھا ہے محض ایک واہمہ ہے- اصل بندر وہ ہے جو آئینہ کے اندر سے مجھے تک رہا ہے- مگر میں نے جلد ہی اپنے آپ کو سنبھالا- منڈیر پر بیٹھ کر اس آئینہ کو ٹکڑے ٹکڑے کیا اور اسی آنگن میں پھینک دیا جس آنگن سے اسے اچکا تھا- دل میں کہا کہ اپنی ذات میں شک کرنا اور پرچھائیوں کے پیچھے دوڑنا تو آدمی کا شیوہ ہے- اس کی کھوپڑی میں قدرت نے ایک ایسی چیز رکھ دی ہے کہ اس میں طرح طرح کے وہم پیدا ہوتے رہتے ہیں- ہم بندر لوگ اپنی الگ کھوپڑی لے کر پیدا ہوئے ہیں- یہ کھوپڑی اوہام و افکار کو راہ نہیں دیتی- بندر نہ فلسفی ہوتا ہے نہ صوفی- بندر بس بندر ہوتا ہے- میں کہ ایک بندر ہوں اپنی کھڑی دم اور بالوں سے ڈھکی کھال کے ساتھ ایک زندہ حقیقت ہوں- اس جنگل کی سب سے بڑی سچائی- آئینہ جھوٹا ہے- آدمی نے ویسے تو بہت سے جھوٹ گھڑے ہیں-

مگر یہ سب سے نرالا جھوٹ ہے۔ ویسے میں استرے سے زیادہ خوف زدہ ہوں۔ چھری، چاقو، کلہاڑی، تلوار یہ سب استرے ہی کی اولاد ہیں آدمی نے پہلے استرا ایجاد کیا۔ اس سے اس نے اپنا سر مونڈا۔ پھر کلہاڑی بنائی جس سے درخت کاٹے۔ پھر تلوار بنائی جس سے اس نے اپنے بھائیوں کے گلے کاٹے۔ آدمی کے ہاتھ میں استرا آیا تو اس نے یہ کیا۔ بندر کے ہاتھ میں استرا آئے گا تو وہ کیا کچھ نہیں کرے گا۔ اے بندرو خدا سے ڈرو اور آدمی کے اثر سے بچو ورنہ یاد رکھو کہ ایک دن وہ آئے گا کہ تمہاری دُمیں غائب ہو جائیں گی اور تم دو ٹانگوں پر چلو گے"۔

اس آخری فقرے پر تو سارے بندر سچ مچ کانپ اٹھے۔ مگر ایک بندر زادہ یوں بولا کہ دُم میں کیا رکھا ہے۔ غائب ہو جائے تو اچھا ہے۔ ہمارے دُم کے ساتھ جو یہ دُم چھلا لگا ہوا ہے اس سے نجات ملے گی۔

یہ بات سن کر تو بندر آگ بگولا ہو گئے۔ اور اس نوخیز بندر کو پھاڑ کھانے کو دوڑے۔ عاقل بندر نے انہیں سمجھایا کہ غصے میں بندروں کو اتنا پاگل نہیں ہونا چاہئے کہ بالکل آدم زاد بن جائیں اور ہم جنسوں کو بھنبھوڑ کھائیں۔ یہ بندر کا بچہ نادان ہے، کج فہم ہے۔ دُم سے محروم مخلوق کے بارے میں کسی سے سن لیا ہے، سو ایسی بات کرتا ہے۔ ورنہ دُم کی اہمیت سے کون انکار کر سکتا ہے۔ جو انکار کرے وہ کافر ہے۔ بندر کی بندریت تو اس کی دُم سے ہے۔ جو دُم نہیں رکھتا وہ کہاں کا بندر ہوا۔

بندروں کا غصہ مشکل سے ٹھنڈا ہوا۔ مشکل سے اپنی جان بچا کر وہ نوخیز وہاں سے نکلا۔ لیکن اس واقعہ کے اثرات دور رس ہوئے۔ دُم اب تک ایک مسلمہ حقیقت تھی۔ اس واقعہ کے بعد وہ ایک اختلافی مسئلہ بن گئی۔ نوجوان طبقہ میں یہ خیال عام ہوتا چلا گیا کہ دُم بندروں کی ترقی کی راہ میں ایک رکاوٹ ہے۔ اکثریوں استدلال کرتے تھے کہ آدمی نے محض دُم نہ ہونے کی وجہ سے اتنی ترقی کر لی ہے کہ آسمانوں میں اڑتا ہے اور پاتال کی خبر لاتا ہے ورنہ اس میں اور کونسی ایسی صفت ہے جو بندروں میں نہیں۔ جیسے بندر ویسے آدمی، بس دُم سے نجات پا کر وہ بندروں سے آگے نکل گئے۔ مگر پرانی وضع کے بندر یہ کہتے تھے

کہ بندر کی بندریت ہی دُم میں پوشیدہ ہے۔ دُم غائب ہو جائے تو بندر اور آدمی میں فرق کیا رہ جائے گا۔ سو اپنی تہذیبی اور قومی شناخت کی خاطر دُم کا تحفظ بہت ضروری ہے۔ یوں بندر نظریاتی طور پر دو گروہوں میں بٹ گئے۔ ایک وہ نوجوان ترقی پسند بندر جو دُم کو ترقی کی راہ میں حائل جانتے تھے۔ اور دُم بریدگی کے مبلغ تھے۔ اور ایک وہ قدامت پسند بندر جو دُم کے علمبردار تھے۔

دُم دشمن نوجوان طبقہ کے خلاف بہت دشنام طرازیاں ہوئیں۔ یہاں تک کہا گیا کہ یہ گمراہ نوجوان بندروں کی اخلاقی قدروں ہی کو نہیں مانتے۔ اور جنسی کجروی کا شکار ہیں۔ اصل میں نئے خیالات طبقہ نسواں میں بھی تیزی سے پھیل رہے تھے جنسی آزادی ان نئے خیالات کا شاخسانہ تھی۔ پرانی وضع کے بندر یہ سوچ سوچ کر پریشان تھے کہ یہ مخرب اخلاق انسانی خیالات بندر سماج کو ایک اخلاقی بحران سے دوچار کر دیں گے۔ مگر نئے خیالات پر اب بند نہیں باندھا جا سکتا تھا۔ نئی نئی تحریکیں شروع ہو رہی تھیں۔ نئے رجحانات پرورش پا رہے تھے۔ اسی ہنگام تحریک تقلید شروع ہو گئی مقلد غیر مقلد کا جھگڑا شروع ہو گیا۔ تقلید پرستوں کا موقف یہ تھا کہ بندروں کی اپنی قدریں فرسودہ ہو چکی ہیں کہ نئے زمانے کے تقاضوں کا ساتھ نہیں دے سکتیں۔ اب انہیں آگے بڑھنے کے لئے آدمیوں کی تقلید کرنی چاہئے غیر مقلد کہتے کہ

تقلید کی روش سے تو بہتر ہے خودکشی

تقلید بندروں کو آدمی کا نقال بنا کر رکھ دے گی اور آدمی کی نقالی سے بندروں کی کیا گت بنتی ہے اس سلسلہ میں وہ ایک حکایت سناتے تھے جو انہوں نے عاقل بندر سے سنی تھی۔ ایک بندر نے کسی بڑھئی کو دیکھا کہ ایک موٹے سے لکڑ پر بیٹھا ہے اور اسے اس طرح پھاڑتا ہے کہ دو میخیں ہاتھ میں ہیں۔ ایک میخ کو لکڑی کے شگاف میں رکھ کر ٹھونکتا ہے۔ جب شگاف زیادہ چوڑا ہو جاتا ہے تو اس میخ کو نکالتا ہے۔ اور دوسری میخ ٹھونک کر لکڑ کو پھاڑنے لگتا ہے۔ بڑھئی یہ کام بیچ میں چھوڑ کر کسی اور کام کو چلا گیا۔ بندر نے اس موقعہ سے فائدہ اٹھایا۔ بڑھئی کی طرح لکڑ پر بیٹھا اور میخیں ٹھونک کر اسے پھاڑنے لگا۔ مگر

وہ ایسے انگھڑ طریقہ سے لکڑ پر بیٹھا تھا کہ اس کے بیضے شگاف میں پھنس گئے۔ ایک میخ کو نکال کر دوسری میخ ٹھونکنا چاہتا تھا مگر تھوڑا سا چونک گیا۔ ایک میخ تو نکال لی۔ دوسری میخ ٹھونکنے میں دیر کر دی۔ ترت لکڑی دونوں طرف سے مل گئی اور بیضے اس کے پچی ہو گئے۔ تب بندر درد سے چلایا اور کہنے لگا کمبخت آدمی کے کام آدمی ہی کو ساجھتے ہیں۔ جو بندر اس کی نقالی کرے گا اس کا حال میرے جیسا ہو گا۔

مگر تقلید کے مخالفوں کی ساری دلیلیں بے اثر ثابت ہوئیں۔ تقلید پرست تقلید کی روش پر اڑے رہے۔ اور ایک دن ایک عجیب واقعہ گزرا۔ بندروں نے ایک نوجوان بندر کو دیکھا کہ اس کی دُم غائب ہے۔ بندروں نے اس دُم کٹے نوجوان بندر کو دیکھا اور حیران ہوئے۔ مگر ایک بندریا اس کی دُم کٹی دیکھ کر اس پر ایسی فریفتہ ہوئی کہ اپنے بندر کو چھوڑ کر اس کے ساتھ ہو لی۔

عاقل بندر کو جب اس واقعہ کا پتہ چلا تو اس نے ماتھا پیٹ لیا اور کہا کہ میں اسی دن سے ڈرتا تھا۔ ناعاقبت اندیش بندروں کے ہاتھوں میں استرا آگیا ہے۔ پہلے وہ اپنی دُمیں کاٹیں گے پھر ایک دوسرے کے گلے کاٹیں گے۔

بندروں کے اس عبرتناک انجام کا تصور کر کے عاقل بندر رویا۔ پھر بندروں کے بیچ سے اٹھ کر دور ایک پہاڑ پہ جا بیٹھا اس طرح کہ اس نے ہونٹوں کو سی لیا تھا، آنکھیں موند لی تھیں اور کانوں میں انگلیاں ٹھونس لی تھیں۔

= = = = = = = =

طوطے مینا کی کہانی

طوطے مینا کی بحث لمبی ہوتی جا رہی تھی۔ روز رات کو وہی قصہ کھڑا ہو جاتا تھا کہ مرد بد ذات ہے یا عورت بد نہاد ہے۔ طوطا کہانی سناتا کہ عورت نے کیسا مکر کیا غریب مرد کو کس کس طرح خراب کیا۔ جواب میں مینا ایک کہانی داغ دیتی۔ مضمون یہ ہوتا کہ مرد بے وفا، سنگدل اور فریبی ہے۔ عورت نیک پارسا ہے، بھولی بھالی ہے، مرد کی ستائی ہوئی ہے

طوطے مینا کی جو کہانی مشہور ہے اس میں تو یہی قصہ چلتا ہے۔ مگر اصل میں وہاں ایک قصہ اور کھڑا ہو گیا تھا۔ جس درخت پہ طوطا مینا بیٹھے یہ بحث کیا کرتے تھے اس درخت پہ اور پرندے بھی بسیرا کرتے تھے۔ وہ سب اس بحث سے تنگ تھے۔ دن بھر کے تھکے ہارے شام پڑے اس درخت کی مختلف شاخوں پر آکر براجتے۔ بعضوں نے گھونسلے بنا رکھے تھے۔ بعض ٹہنی پہ بسیرا کرتے۔ آگے کتنے آرام سے رات بسر کرتے کہ اندھیرا ہوا اور سب اپنی اپنی جگہ چپ جو ہے اپنی جگہ چونچ بند کیے آنکھیں موندے بیٹھا ہے۔ مگر جب سے اس طوطے اور مینا نے اس پیڑ پہ اپنا ٹھکانا بنایا تھا تب سے ان کی راتوں کا سکون غائب ہو گیا تھا۔ سب پرندے بیکل تھے۔

اسی درخت پہ ایک پودنے اور پودنی کا بھی بسیرا تھا۔ پودنی طوطے مینا کی اس بحث پہ کچھ زیادہ ہی ناخوش تھی۔ ایک رات چڑ کر پودنے سے کہنے لگی "ان طوطے مینا پہ خدا کی مار، انہوں نے کیا کتے کا مغز کھایا ہے کہ رات بھر بھونکتے رہتے ہیں"۔

پودنے نے بے اعتنائی سے کہا کہ "ایک دوسرے کا مغز چاٹتے ہیں' ہمارا کیا لیتے ہیں"۔

"یہ تم نے اچھا کہا کہ ہمارا کیا لیتے ہیں۔ انہوں نے تو ہمارا چین آرام لے لیا۔ آخر یہ مرد عورت ہیں کون جناور کہ ان کا مقدمہ طے ہونے میں نہیں آرہا"۔

"نیک بخت تو مرد عورت کو نہیں جانتی - آدم زاد ایک مخلوق ہے جس نے اپنے نر کو مرد کا اور مادہ کو عورت کا نام دے رکھا ہے۔

"مگر اس غیر مخلوق سے طوطے مینا کا کیا رشتہ ہے۔"

پودنے نے زہر خند کیا اور کہا کہ "بہت گہرا رشتہ ہے۔ یہ دونوں اس مخلوق کی قید میں رہے ہیں اور اس مخلوق نے یوں تو طرح طرح کی ایجاد کی ہے۔ مگر اس کی سب سے انوکھی ایجاد وہ ہے جسے پنجرہ کہتے ہیں۔ میری جان پنجرہ عجب چیز ہے۔ جو ایک مرتبہ پنجرے میں چلا گیا وہ پنجرے سے نکل بھی آئے تو پنجرے ہی میں رہتا ہے۔ تو سمجھو کہ یہ دونوں ابھی تک پنجرے میں ہیں۔ آدمی کا بھوت ان پر سوار ہے۔ اسی کا راگ الاپتے رہتے ہیں۔"۔

"پھر آدمیوں ہی میں جا کے مریں"۔ پودنی نے جھلا کر کہا "ہماری نیندیں کیوں خراب کرتے ہیں"۔

"نیک بخت' وہ یہاں کہاں ہیں۔ ان کا دم وہیں اٹکا ہوا ہے - جب سے آئے ہیں مجال ہے کہ انہوں نے ہم پہ طائرانہ نظر بھی ڈالی ہو۔ آدم زاد کے اگلے پچھلے اصلی فرضی قصے بیان کر کر کے کٹ حجتی کرتے رہتے ہیں یہ کٹ حجتی بھی تو اسی مخلوق کا وطیرہ ہے۔ ہم پرندے کٹ حجتی کیا جانیں۔ بحث مباحثہ ہمارا شیوہ نہیں - ہم تو بس چہچہاتے ہیں"۔

پودنی نے قصے کو مختصر کیا اور کہا "میرے سرتاج' میرا گزارا ان نحوست ماروں کے ساتھ نہیں ہو گا۔ میری تو صحت کو گھن لگ گیا - نیند جو نہیں آتی۔ ان کا کوئی بندوبست کرو۔ یا تو وہ چونچ بند رکھیں یا پھریاں سے لمبے بنیں۔ اور پیڑ بھی تو ہیں وہاں جاکر ٹیں ٹیں کریں"۔

پودنے کو اب واقعی سنجیدگی سے سوچنا پڑا۔ بہت سوچ کر ایک دم سے پھریری لی۔ کہا

کہ "جاکر ان سے بات کرتا ہوں"۔ یہ کہہ کر پھر سے اڑ طوطے مینا والی شاخ پہ جا اترا۔ اس وقت مینا کہانی سنا رہی تھی۔ اسے پودنے کا یوں بیچ میں آن دھمکنا اچھا نہیں لگا۔ بولی "بھائی پودنے، اس رات گئے کیا آفت آن پڑی کہ بے آرام ہوئے اور یہاں آئے"۔

"اری بھینا مینا، آرام اب کہاں۔ تمہاری عورت مرد کی رام کہانی عجب ہے ہماری تو رات کی نیند غائب ہو گئی۔ یہ عورت مرد کا مقدمہ کچھ زیادہ ہی لمبا ہو گیا"۔

"ہاں لمبا تو ہو گیا"۔ طوطا بولا" جب سے اماں حوّا نے بیچارے باوا آدم کو پھسلا کر گندم کا دانہ کھلایا ہے اس وقت سے چل رہا ہے۔ اور جوں جوں وقت گزر رہا ہے اس میں پیچ پڑتے چلے جا رہے ہیں خیر میں نے تو دودھ کا دودھ پانی کا پانی کر دیا تھا۔ مگر مینا نے ضد پکڑی ہے مانتی ہی نہیں"۔

مینا نے ترت جواب دیا" میں نہ مانوں والی روش تو تم نے اپنائی ہوئی ہے۔ میں نے مرد کے سارے عیب بکھان ڈالے۔ کونسا عیب ہے جو مرد میں نہیں ہے۔ مگر مرد نے جو تمہیں ایک سبق رٹا دیا ہے وہی دہرائے چلے جا رہے ہو کہ مرد کی ذات بے عیب ہے۔ عورت عیبوں کی پوٹ ہے"۔

"نیک بختو، تم دونوں اپنی اپنی بات پہ اڑے ہوئے ہو۔ ایسے تو یہ معاملہ نہیں نبٹے گا"۔

پودنا یہ کہتا تھا کہ مور اپنی شاخ سے اڑا اور ان کے برابر آن بیٹھا۔ پودنے کی بات اس نے سن لی تھی۔ اس سے اسے شہ ملی۔ کہنے لگا" صاحبو، صاف بات ہے۔ طوطے مینا کی بحث و تکرار ہمیں بہت مہنگی پڑ رہی ہے۔ میری مورنی ساری رات بے آرام رہتی ہے۔ صبح اٹھتی ہے تو مزاج چڑ چڑا ہوتا ہے۔ تو اس قصے سے ہمارے گھر میں ایک پریشانی آگئی ہے۔ میں پوچھتا ہوں کہ ڈھڈو عورت اور ٹٹو مرد کا قصہ کب تک چلے گا"۔

مورنی نے اپنے مور کو برہمی سے بولتے سنا تو اس نے بھی پر پھڑ پھڑائے اور ان کے بیچ میں آن اتری۔ اس نے ایک اور سوال کھڑا کر دیا" میں یہ پوچھوں ہوں کہ یہ دونوں پنچھی ہیں کون، کہاں سے آئے ہیں۔ آپس میں ان کا تعلق کیا ہے کہ چونچ سے چونچ ملا کر

باتیں کرتے رہتے ہیں۔

طوطا اور جنس مینا اور جنس۔ پھر یہ اتنے شیر و شکر کیسے ہو گئے کہ رات رات بھر کھسر پھسر کرتے رہتے ہیں"۔

مورنی کی اس بات پر چکوی کے کان کھڑے ہوئے جو برابر والے درخت پہ بیٹھی تھی۔ اس نے چکوے کو ٹہوکا "اے میں نے کہا کہ تم تو اسی درخت پہ بیٹھے ہو یہ وہاں کیا باتیں ہو رہی ہیں"۔

"طوطا مینا نے آدم زاد کا قصہ شروع کر رکھا تھا۔ اس سے ایک فساد اٹھ کھڑا ہوا ہے۔ ہونا ہی تھا۔ جہاں آدم زاد وہاں فساد"۔

"مگر مورنی کیا کہہ رہی ہے"۔

"مورنی تو بے پر کی اڑاتی رہتی ہے"۔

"مگر سننا تو چاہئے کہ وہ کیا کہہ رہی ہے"۔

سو چکوا چکوی بھی اڑ کر وہاں جا پہنچے۔ چکوی نے مورنی کی بات پر گرہ لگائی "حیا بھی کوئی چیز ہے۔ ہم چکوا چکوی خیر سے میاں بیوی ہیں۔ لیکن کبھی ایک شاخ پر اکٹھے بسیرا نہیں کیا۔ میں ایک درخت پر تو چکوا دوسرے درخت پر"۔

پودنی بھی آن پہنچی تھی اور چکوی کی ہاں میں ہاں ملا رہی تھی۔ پودنا عقلمند تھا۔ دیکھا کہ مادائیں تو اس قصے کو کچھ اور ہی رنگ دینے پہ تلی ہیں۔ اس نے ان کی باتوں کو کاٹا اور بولا" میرے خیال میں فساد کی جڑ آدم زاد کا قصہ ہے۔ اس قصے کو ختم ہونا چاہئے۔ نہیں تو نئے نئے قصے شروع ہو جائیں گے اور ہم پرندوں کی دنیا کا امن سکون بالکل برباد ہو جائے گا"۔

چکوے نے تائید میں سر ہلایا "ٹھیک کہتے ہو میاں پودنے۔ ہماری عافیت اسی میں ہے کہ آدم زاد کا یہ قصہ کسی طرح سے ختم ہو"۔

پودنے کو چکوے کی حمایت سے شہ ملی۔ اس نے اب زیادہ کھل کر طوطے مینا سے بات کی "نیک بختو، تم دونوں اپنی اپنی بات پر اڑے ہوئے ہو۔ ایسے تو یہ قصہ ختم نہیں

ہوگا۔ بہتر یہ ہے کہ کسی منصف مزاج کو بیچ میں ڈالو۔ وہ تمہارے درمیان منصفی کرے اور مقدمے کا فیصلہ سنائے"۔

"اچھی تجویز ہے"۔ طوطا بولا" مگر منصف مزاج یہاں کون ہے جس سے فیصلہ کرائیں۔

"مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے"۔ پودنا بولا" کہ تم دونوں نے پنجروں میں زندگی گذاری ہے اور بس آدم زاد کو دیکھا ہے اس لئے تمہیں کوئی منصف مزاج نظر نہیں آتا۔ پرندوں کو تم نے کہاں برتا ہے"۔

"اچھا تو پھر بتاؤ کہ کس کو منصف بنائیں"۔

پودنا مور اور چکوے سے مخاطب ہوا" کیا خیال ہے کسے منصف بنائیں"۔

مور شش و پنج میں پڑ گیا۔ مگر چکوے نے سوچ کر مناسب تجویز پیش کی۔ کہا" اس جنگل میں دانا بینا تو ایک ہی ہے۔ وہ الو ہے۔ سب سے الگ تھلگ بیٹھا ہے۔ نہ کسی کے لینے میں نہ کسی کے دینے میں - بس گہری سوچ میں ڈوبا رہتا ہے"۔

"بالکل ٹھیک" پودنے نے کہا" ہمیں الو کی خدمت بابرکت میں چل کر اس سے التجا کرنی چاہئے کہ اس مقدمے کے بیچ انصاف کرو ار اسے بنٹاؤ۔ کہو مینا بی اور طوطے میاں تمہیں یہ تجویز منظور ہے"۔

طوطے اور مینا دونوں نے پرندوں کی برہمی اور خاص طور پر ملاؤں نے جو شگوفہ چھوڑا تھا اسے دیکھتے ہوئے خیریت اسی میں دیکھی کہ یہ تجویز مان لی جائے۔

سو سب پرندے اڑے - پودنا آگے آگے باقی سب پیچھے پیچھے - جنگل کے اس اجاڑ گوشے میں پہنچے جہاں سب سے الگ ایک لنڈمنڈ پیڑ کے ایک ترے مڑے ٹھنٹھ پر الو اکیلا آنکھیں موندے اونگھ رہا تھا۔ پروں کی پھڑ پھڑاہٹ سن کر ایک الکساہٹ کے ساتھ آنکھیں کھولیں، پرندوں کے غول کو دیکھا اور خشک لہجہ میں بے وقت آنے کی وجہ پوچھی۔

پودنے نے ادب سے گذارش کی "اے دانا بینا طائر، ہم پرندے معافی چاہتے ہیں کہ ہم تیری خلوت میں مخل ہوئے۔ مگر کیا کرتے۔ ہم ایک الجھن میں پھنس گئے ہیں۔ طوطے

مینا کے درمیان ایک جھگڑا کھڑا ہو گیا ہے جس نے ہمارے سکون کو برباد کر دیا ہے۔ اے بزرگ طائر تو دانا ہے اور منصف مزاج، اس مقدمے کے بیچ فیصلہ کر کہ اس جھگڑے سے ہمیں نجات ملے"۔

"عزیز پرندو وہ جھگڑا کیا ہے"۔

"جھگڑا یہ ہے کہ وہ جو آدمی نام کی مخلوق ہے اس میں نیک کون ہے، بد کون ہے۔ مرد یا عورت۔ مینا عورت کو نیک پارسا اور مرد کو بد بتاتی ہے۔ طوطا مرد کو نیک پاک اور عورت کو بد بتاتا ہے"۔

آدمی کا نام سن کر الو کے مزاج میں برہمی پیدا ہوئی۔ تلخ لہجہ میں بولا" اے طائران خوش الحان، تم کس مخلوق کا مسئلہ لے کر میرے پاس آئے ہو۔ عورت اور مرد میں سے اچھا کسے کہا جائے عورت آفت کی پڑیا، مرد پور پور میں فتنہ اس لئے کہ دونوں آدمی کی ذات ہیں۔ اور آدمی بدذات ہے۔ بدذات سا بدذات، سبز قدم خود ہے، منحوس مجھے بتاتا ہے۔ خود بستیاں اجاڑتا ہے، نام میرا بدنام کرتا ہے۔ اس کا یہ طور دیکھ کر جی اپنا سرد ہوا، صحبتوں سے نفور ہوا، عزلت نشینی کو شعار کیا۔ دن کی روشنی ہی سے بیزاری ہو گئی کہ اس روشنی میں خواہ مخواہ اس بدذات کی صورت دیکھنی پڑتی تھی۔ رات کا اندھیرا اور سناٹا جی کو خوش آیا۔ مگر اس مخلوق نے ایسی کارستانی کی کہ اب راتوں کی پاکیزگی بھی جاتی رہی۔ اب صورت یہ ہے کہ دن میں آدم زاد کا شوروغل، رات کو اس کی بنائی ہوئی مشینوں کا شور اور بجلی کی روشنی۔ ہم عزلت نشین کہاں جاکر منہ چھپائیں۔ ہر جگہ اس سبز قدم کے قدم پہنچے ہوئے ہیں۔ ابھی پچھلے دنوں کی بات ہے کہ لٹی پٹی ادھ موئی مرغابیوں کا ایک قافلہ ہانپتا کانپتا قائیں قائیں کرتا اپنے اس ویرانے میں آکر پناہ کا طالب ہوا۔ میں حیران و پریشان کہ کس دیس کی مخلوق اور کہاں آکر پناہ مانگ رہی ہے۔ میں نے کہا کہ اے طائران عزیز تم پہ کیا افتاد پڑی کہ تم نے اپنے ٹھنڈی لہریں لیتی آبی اقلیم کو چھوڑا اور یہاں اس ویرانے میں اس حال سے آئے ہو کہ جیسے کسی نے تم سے تڑپنے پھڑکنے کی توفیق ہی سلب کر لی ہو۔ انہوں نے ٹھنڈا سانس بھر کر کہا کہ کیسی آبی اقلیم اب وہاں پٹرول امنڈ رہا ہے۔ آدم

زاد نے اپنے آپس کے جھگڑے میں ہمارے سمندر کی پاکیزگی کو غارت کر دیا۔ مت پوچھو کہ ان پانیوں میں کیا کیا زہر گھولا گیا ہے۔ میں سناٹے میں آ گیا کہ اس بدذات نے ہوا میں تو پہلے ہی کثافت گھول دی تھی' اب سمندروں میں بھی زہر گھول دیا۔ میں نے ٹھنڈا سانس بھرا اور آسمان کی طرف دیکھا۔ مگر آسمان پر الگ ایک قیامت مچی ہوئی تھی۔ فضا دھواں دھار پرندے مضطرب جیسے کسی بڑی آندھی نے انہیں آلیا ہو"۔

الو کا یہ کلام سن کر سب پرندے سکتہ میں آ گئے۔ پودنا تشویش کے ساتھ بولا "اے دانا اس نقشہ میں تو مجھے سب پرندوں کی تباہی کا سامان نظر آ رہا ہے۔ آدمی ہمارا کیوں دشمن بنا ہوا ہے"۔

"وہ خود اپنا بھی دشمن بنا ہوا ہے۔ اس میں اس کی اپنی تباہی کا بھی تو سامان ہے"۔

"پھر تو آدمی کو سوچنا چاہیئے کہ وہ کیا کر رہا ہے"۔

اس پر چکوے نے ٹکڑا لگایا "اس کے پاس عقل ہو تو سوچے"۔

الو نے چکوے کی آدم شناسی کو سراہا اور افسوس کے ساتھ کہا "کمبخت کے پاس ذہن ہے مگر عقل نہیں ہے"۔

"آدمی کو عقل کب آئے گی"۔ پودنے نے سوال کیا۔

"پودنے' تو نے مشکل سوال کیا ہے"۔ الو بولا "اس سوال کا جواب میرے پاس نہیں ہے"۔

"پھر کس کے پاس ہے"؟

الو نے لمبا تامل کیا۔ پھر بولا "یہاں سے دور ہمالہ کی تلہٹی میں ایک گھنا جنگل ہے۔ وہاں پیپل کا ایک بلند وبالا درخت ہے اس کی پھننگ پہ ایک کوّا بیٹھا ہے۔ جنگل کے پرندے اسے کاکا منی کہتے ہیں۔ اس کے پاس تیرے سوال کا جواب ہو تو ہو"۔

پودنے نے ساتھی پرندوں سے کہا کہ "ساتھیو' کاکا منی کے پاس چلو کہ ہم اس سے اپنے سوال کا جواب لیں"۔

تو پھر پودنا آگے آگے' باقی پرندے پیچھے پیچھے۔ یوں یہ قافلہ ہمالہ کی تلہٹی کی طرف

چلا۔ رستے میں ایک تیتر ملا۔ اس نے پوچھا "اے دوستو کدھر کی اڑان ہے"۔

پودنے نے جواب دیا "ہم کاگامنی سے یہ پوچھنے جا رہے ہیں کہ آدمی کو عقل کب آئے گی۔ تو بھی ساتھ چلا چاہے تو چل"۔

تیتر نے ایک قہقہہ لگایا "آدمی اور عقل، سبحان تیری قدرت"۔ پھر اس نے پر پھڑپھڑائے اور اڑ گیا، مستقل ہنستا ہوا اور شور مچاتا ہوا "آدمی اور عقل، سبحان تیری قدرت آدمی اور عقل سبحان تیری قدرت۔"

ہرج مرج کھینچتا یہ قافلہ ہمالہ کی تلہٹی میں پھیلے ہوئے گھنے جنگل میں پہنچا۔ دیکھا کہ درختوں کے بیچ ایک بلند وبالا پیپل ہے جس کی پھننگ پہ ایک بڑا سا کوّا ایک پنکھ کالا ایک پنکھ سفید، آنکھیں موندے، چونچ پروں میں دئے بیٹھا ہے۔ پودنے نے قریب جا کر بڑے ادب سے کہا کہ "اے کاگامنی، ہم دور سے چل کر تمہارے پاس آئے ہیں"۔

کاگامنی نے آنکھیں کھولیں۔ پوچھا "کارن؟"

"کاگامنی، ہم تم سے یہ پوچھنے آئے ہیں کہ آدمی کو عقل کب آئے گی"۔

کاگامنی نے ٹھنڈا سانس بھرا "بھولے پنچھیو، تم نے میرے ساتھ وہی کیا جو میں نے اپنے باپ کے ساتھ کیا تھا"۔

"کاگامنی، تم نے اپنے باپ کے ساتھ کیا کیا تھا"

"میرا باپ" کاگامنی سنانے لگا "تپ میں تھا۔ ہزار برس تپ میں گذر چکے تھے۔ اس سے اس کے پروں کی ساری کالونس ڈھل چکی تھی۔ ایک پنکھ پر بس ایک کالی ٹکلی باقی رہ گئی تھی۔ اس بیچ میں اس کے پاس پہنچا اور یوں بولا کہ اے میرے باپ ایک بات پوچھوں۔ اس نے آنکھیں کھولیں اور کہا، پوچھ۔ باپ میں پوچھتا ہوں کہ آدمی کو کبھی عقل آئے گی یا نہیں آئے گی۔ باپ نے مجھے گھور کے دیکھا، پتر تو کدھر سے آرہا ہے۔ باپ میں اڑتا اڑتا کوروکشیتر کی اور نکل گیا تھا۔ وہاں میں نے دیکھا کہ آدمی آدمی کو مار کاٹ رہا ہے۔ اور خون کی ندیاں بہہ رہی ہیں۔ باپ نے ٹھنڈا سانس بھرا، بولا، پتر میں نے تجھے منع کیا تھا کہ سب کھونٹ جانا ناتو کھونٹ مت جانا۔ اور کبھی آکر مجھ سے اس کی بات مت کرنا۔ ہم

کوّے لوگ پہلے اجلے ہوا کرتے تھے۔ آدمی کا وبال ہم پہ پڑا ہے کہ ہم کالے ہو گئے ہیں۔ یہ تپ میں اسی لئے کھینچ رہا تھا کہ یہ وبال اترے اور ہم پھر اجلے ہو جائیں۔ پر تو نہ مانا' مانو کھونٹ گیا اور آکر مجھ سے اس جاتی کی بات کی۔ تو نے میرے تپ کو بھنگ کر دیا۔ اس کے ساتھ میری عمر ختم ہوئی۔ تجھ میں ساہس ہو تو میرے تپ کو پورا کر اور اپنی جاتی کے گئے ہوئے اجلے پن کو واپس لا۔ یہ کہہ کر اس نے پران دیدئے۔ میں نے اس کے جانے کا شوک کیا اور تپ کے لئے بیٹھ گیا۔ سو میں تپ میں تھا کہ تم نے آکر اس میں کھنڈت ڈال دی۔ اب میں یہاں سے اڑتا ہوں اور کسی نرجن بن میں باس کرتا ہوں جہاں میرے کان میں آدمی کا نام نہ پڑے"۔

یہ کہہ کر کاگا منی نے پر پھڑ پھڑائے اور اڑنے کے لئے تیار ہوا پودنے نے گھبرا کر جلدی سے پوچھا "مگر منی جی' ہمارے سوال کا جواب اب کہاں سے ملے گا"۔

کاگا منی نے تامل کیا پھر بولا "یاں سے دکھن کی اور تاپتی ندی کے پار شوجی کا پرانا مندر ہے۔ اس کے کلس پہ ایک نیل کنٹھ بیٹھا ہے کہ بگوں کے بھید جانتا ہے۔ اس سے جا کر پوچھو"۔

پھر پودنا آگے آگے تھا اور مور مورنی چکوا چکوی' طوطا مینا اور کتنے دوسرے پرندے کہ رستے میں ساتھ ہو لئے تھے پیچھے پیچھے اڑتے اڑتے تاپتی ندی کے پار شوجی کے پرانے مندر پہنچے۔

نیل کنٹھ نے پروں کی پھڑ پھڑاہٹ اور بھانت بھانت کی چہکار سن کر آنکھیں کھولیں "مترو کس دیس سے آئے ہو اور کیوں آئے ہو"۔

"مہاراج" پودنے نے ادب سے کہا "ہم دور سے پتہ پوچھتے پوچھتے آپ کے پاس آئے ہیں۔ ایک سوال ہمیں در در لئے پھر رہا ہے۔ جس سے پوچھتے ہیں وہ کنی کاٹ جاتا ہے۔ سب طرف سے مایوس ہو کر آپ سے پوچھنے آئے ہیں"۔

"پوچھو مترو"۔

"مہاراج' ہم آپ سے یہ پوچھنے آئے ہیں کہ آدمی کو آخر کب عقل آئے گی"۔

نیل کنٹھ نے حیرت سے پودنے کو اور اس کے ساتھیوں کو دیکھا۔" کہا "بھولے پنچھیو' کیا تمہاری مت ماری گئی ہے کہ ایسا پوچھتے ہو۔ مجھے نہیں دیکھتے کہ میری ساری گردن نیلی ہو رہی ہے۔ سمندروں میں جو وِش گھلا ہوا تھا کن مشکلوں سے میں نے اس سارے وِش کو پیا کہ میں نیلا پڑ گیا۔ پر آدمی نے سمندروں میں پھر وِش گھول دیا۔ سمندروں میں' بنوں میں' پربتوں میں' ہر جگہ۔ متّرو' آدمی مورکھ ہے"۔

"مہاراج" پودنا بولا "یہی فکر تو ہمیں کھائے جا رہی ہے کہ اس نادان کو کبھی سمجھ آئے گی بھی یا نہیں"۔

"پنچھیو" نیل کنٹھ نے انہیں سمجھاتے ہوئے کہا "ہر پشو پنچھی کے پاس اپنے اپنے حصے کی عقل ہے۔ پر آدمی نرالا پشو ہے کہ اسے ذہن تو ایسا ملا کہ آسمان میں تھگلی لگاتا ہے پر عقل نہیں ملی"۔

پودنے نے آدمی کے حال پہ افسوس کیا اور کہا "مہاراج اگر میں اپنے حصے کی عقل آدمی کو دیدوں تو پھر تو اس میں کچھ سوجھ بوجھ آجائے گی نا؟"

نیل کنٹھ اداسی سے ہنسا اور بولا" پودنے' کیا تو نے اس کوّے کی کہانی نہیں سنی جس نے آدمی کو عقل سکھانے کی کوشش کی تھی"۔

اور نیل کنٹھ نے انہیں کہانی یوں سنائی کہ اب سے بہت پہلے ایک آدم تھا' سمجھو کہ اس دھرتی پہ پہلا پرش۔ اس کے دو بیٹے تھے۔ ایک بیٹے نے جو کہ بہت مورکھ تھا دوسرے کی ہتیا کر دی۔ کرنے کو تو کر دی پر اس ہتیارے کی سمجھ میں نہ آیا کہ اس کی لاش کا کیا کرے۔ اس مورکھ نے بھائی کی لاش کو کمر پہ لادا اور چل پڑا۔ ساری دھرتی کھوند ڈالی' پر مت ایسی ماری گئی کہ سمجھ میں نہ آیا کہ اسے کہاں ٹھکانے لگائے۔ اس کی کمر دکھنے لگی۔ ایک کوّے نے اسے اس حال میں دیکھ کر ترس کھایا اور کہا کہ عقل کے اندھے' بھائی کی لاش کو کمر پہ لادے کب تک پھرے گا۔ اس نے دکھی ہو کر کہا کہ پھر کیا کروں اور کیسے اس بوجھ کو اتاروں۔ کوّے نے کہا کہ گڑھا کھود اور اس میں اسے داب دے۔ اس نے ایسا ہی کیا۔ کوّے نے جب اپنے باپ کو یہ بات سنائی تو اس نے سر پیٹ

لیا- پتر یہ تو نے کیا کیا- کوا بہت سٹپٹایا کہ آخر اس نے ایسا کونسا پاپ کر دیا- "ارے پاپ سا پاپ" کوے کا باپ بولا" ہم اجلے پنکھوں کے ساتھ پیدا ہوئے تھے- اب اس کارن ہمارے پنکھ کالے پڑ جائیں گے"-

"باپ ہمارے پنکھ کس کارن کالے پڑ جائیں گے - میں نے تو اس مورکھ کو عقل کی بات بتائی تھی جو اس کے بھلے میں تھی"-

"بھولے بیٹے ' مورکھ کو عقل کی بات بتانا ایسے ہے جیسے بندر کے ہاتھ میں استرا دیدیا جائے- اب یہ مورکھ پتہ ہے کیا کرے گا- سدا پاپ کرے گا اور تیری بتائی ہوئی ترکیب سے پاپ کو چھپایا کرے گا - وبال اس کا ہم پر پڑے گا کہ ہمارے اجلے پر کالے ہو جائیں گے"-

پرندے یہ قصہ سن کر سوچ میں پڑ گئے اور طوطے مینا کی آنکھیں تو کھلی کی کھلی رہ گئیں"-

پودنے نے لمبے تامل کے بعد سوال کیا" تو مہاراج پھر کیا کیا جائے نیل کنٹھ نے کہا "مترو اپنی عقل اپنے ساتھ - کوئی کسی کو عقل نہیں سکھا سکتا- جو مورکھ ہے وہ مورکھ ہی رہے گا- آدمی مورکھ ہے"-

یہ کورا جواب سن کر وہ پرندے وہاں سے اداس اداس لوٹے- اپنے جنگل میں آکر اپنی اپنی شاخ پہ بیٹھ گئے- سب اپنی اپنی جگہ چپ تھے اور اداس طوطے مینا پہ تو جیسے اوس پڑ گئی ہو- نہ طوطے نے چونچ کھولی نہ مینا کچھ بولی-

چکوی سے رہا نہ گیا - چکوے سے بولی"میرے سرتاج ' طوطے اور مینا کو کیا ہو گیا ہے - کہاں رات رات بھر آدم زاد کے قصے سناتے تھے جیسے دنیا میں آدم زاد کے سوا کوئی مخلوق بستی ہی نہیں اور کہاں اب ایسی چپ سادھی ہے کہ جیسے منھ میں زبان ہی نہیں ہے"-

چکوا مسکرایا - بولا" جانم- اب انہیں عقل آ گئی ہے- آخر کو پنجرے سے باہر نکل آئے"-

بخت مارے

ایک دہشت نے آناً "فاناً" انہیں آلیا تھا - اوپر کا سانس اوپر نیچے کا سانس نیچے، جیسے سانس لیا تو پستول کی لبلبی دبے گی اور انکے سانس کا رشتہ ہمیشہ کے لئے ٹوٹ جائے گا۔ جو نوجوان پستول تانے اکڑا کھڑا تھا اس نے انہیں خبردار کر دیا تھا کہ کوئی اپنی جگہ سے ہلا تو گولی اس کے سینے کے پار ہو گی۔ تنبیہہ کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ کمرے میں سب اپنی اپنی جگہ اپنے اپنے بستروں میں دم بخود بیٹھے تھے - ساکت جیسے پتھر کے بنے ہوں۔ اور اماں جی تو بالکل ہی بت بن گئی تھیں پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھے جا رہی تھیں کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ انہیں کچھ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ جاگی ہی نہ ہوں، بس ایک ڈراؤنا خواب دیکھ رہی ہوں۔ سب سے زیادہ دہشت زدہ وہی تھیں۔ مگر سب سے پہلے دہشت کے اثر سے بھی وہی نکلیں۔ دہشت کی گھڑی طوالت کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ اور آدمی تنا ہوا کتنی دیر رہ سکتا ہے۔ تو ہوا یوں کہ اماں جی کتنی دیر تک خوف میں ڈوبی بے سدھ بیٹھی رہیں۔ مگر رفتہ رفتہ اس طلب نے جو ان کی جان کے ساتھ لگی ہوئی تھی ان کے اندر سر اٹھایا۔ انھیں جماہیاں آنی شروع ہو گئیں جن کا صاف مطلب یہ تھا کہ انہیں اب پان کی طلب ستا رہی ہے - یہ ان کی پرانی عادت تھی کہ رات کے بیچ آنکھ کھلنے پر وہ پلنگ کے برابر رکھی ہوئی چھوٹی سی میز کو قریب گھسیٹتیں پان بنا کر ڈاڑھ میں رکھتیں اور پھر فوراً ہی سو جاتیں - مگر آج جس عالم میں جاگی تھیں وہ تو عالم ہی اور تھا۔ بس ایک ڈراؤنے خواب کے بیچ جاگی تھیں۔ ایسے

عالم میں تو بھوک پیاس اڑجاتی ہے - پان کی طلب تو دور کی بات ہے کتنی دیر تک وہ بس خوف کی پوٹ بنی بیٹھی رہیں- کسی اور بات کا خیال ہی نہیں آیا- لیکن اخر کب تک- ڈراونا خواب طول کھینچتا چلا جا رہا تھا- اماں جی کو جماہیاں آنی شروع ہو گئیں- ان جماہیوں نے انہیں احساس دلایا کہ کتنی دیر سے انہوں نے پان نہیں کھایا ہے- اس خیال کے ساتھ ہی ان کی نظریں میز پر رکھے پاندان پر گئیں- ویسے تو میز پلنگ کے قریب ہی تھی- مگر اچانک وہ بہت دور سرک گئی تھی- قریب رکھا ہوا پاندان کتنی دور چلا گیا تھا جیسے سات سمندر پار سے للچا رہا ہو- بس لمحہ بھر کے لئے یہ فاصلہ درمیان سے غائب ہوا تھا- غیر ارادی طور پر ان کا ہاتھ میز کی طرف بڑھنے لگا تھا کہ سامنے تنا ہوا پستول جیسے بالکل سینے پر آگیا ہو- اماں جی پھیلنے سے پہلے پھر سمٹ گئیں-

پستول کی دہشت اور پان کی طلب کے بیچ ڈانواڈول اماں جی سخت اذیت میں تھیں- پاندان تک رسائی کیسے حاصل کی جائے' بس اس مسئلہ نے انہیں اپنے گھیرے میں لے لیا- باقی سارا قصہ پس منظر میں چلا گیا- کتنی دیر تک وہ اس ادھیڑ بن میں رہیں کہ پاندان کو کس طرح اپنی طرف سرکایا جائے کوئی ترکیب سمجھ میں نہ آئی- پھر کیا کیا جائے- پان تو بہرحال کھانا ہے- آخر کو اماں جی نے اسی نوجوان سے "رجوع کیا جو سامنے پستول تانے اکڑا کھڑا تھا-"اے بیٹا" کس لجاجت سے اس سے مخاطب ہوئیں" تیرا بڑا احسان ہو گا- یہ میرا پاندان جو ہے ناذرا میری طرف سرکا دے- بس ایک کتر منہ میں رکھ لوں"-

"خاموش" نوجوان نے کڑک کر کہا اور پستول کو ایسے گردش دی جیسے چلانے لگا ہے" اپنی جگہ سے کوئی ہلا تو گولی مار دوں گا"- اور اس کے ساتھ ہی اس نے غضب ناک نظروں سے ایک ایک کو دیکھا' اماں جی کو' ان کی بہو کو جسے گھر کی بیگم سمجھنا چاہئے' اس نوجوان لڑکی کو جو اماں جی کی پوتی اور اس بی بی کی بیٹی تھی' اس ادھیڑ عمر شخص کو جو اماں جی کا بیٹا تھا- سب ایک مرتبہ پھر دہل گئے - اور سانس پھر اوپر کا اوپر نیچے کا نیچے

دو سنڈے مسٹنڈے کہ تھوڑی دیر پہلے پستول کے زور پر بیگم سے تالیوں کا گچھا لے کر سٹور کے اندر گئے تھے بجلی کی تیزی سے پستول تانے باہر نکلے گھور کے ساکت وجامد مکینوں

کو قہر بھری نظروں سے دیکھا۔ ان میں جو سینئر نظر آتا تھا وہ نوجوان سے مخاطب ہوا" کامریڈ 'کیا بات ہے"؟

"باس ' یہ بڑھیا بولتی ہے"۔

"کیا بولتی ہے"۔

"پان کھانا مانگتی ہے۔ بولتی ہے ہمیں پاندان دیدو"۔

"پاندان ؟" اور باس کی تیز شک بھری نظریں پاندان پر مرکوز ہو گئیں۔ ساتھی سے جو اس کے ساتھ سٹور سے نکلا تھا اور جسے اس کا نمبر۲ سمجھنا چاہیئے مخاطب ہوا" کامریڈ' تم اپنا کام کرو۔ میں دیکھتا ہوں کہ یہ پاندان کا کیا چکر ہے"۔

"باس ضرور اس میں کوئی چکر ہے "۔ نمبر۲ نے کہا اور فوراً ہی واپس سٹور میں چلا گیا۔

"باس نے پاندان کا تفصیل سے جائزہ لینا شروع کر دیا۔ اس خانے کا زیادہ تفصیل سے جائزہ لیا جس میں الرم سٹرم چیزیں بھری ہوئی تھیں۔ ایک ملی دلی پیچک اس میں اڑی ہوئی دھاگا پڑی ہوئی ایک سوئی ' رنگ برنگے بٹن ' تڑی مڑی ایک انگوٹھی ' ایک سرمہ دانی وغیرہ وغیرہ

" بیٹے ' ذرا احتیاط سے دیکھو کتھا میں نے آج ہی بھرا ہے۔ کلھیا ذرا بھی چھلکی تو سارا پاندان خراب ہو جاوے گا"۔

"خاموش" نوجوان ایک دفعہ پھر کڑکا۔

کڑک تو اس آواز میں ویسی ہی تھی۔" مگر اس کا اثر اس بار ویسا نہیں ہوا جیسے پہلے ہوا تھا۔ اماں جی نے تو جیسے سنا ہی نہ ہو۔

"اماں جی"۔ بیٹے نے اپنے بستر پہ بیٹھے بیٹھے بے بسی سے ماں کو دیکھا" انہیں اپنا کام کرنے دیں۔ مت ٹوکیں"۔

پاندان سے جب کچھ برآمد نہ ہوا تو باس نے بیزاری سے اسے اماں جی کی طرف سرکا دیا" لے بڑھیا ' تو پان کھا"۔ اور اٹھ کر تیزی سے سٹور کی طرف چلا گیا۔

اماں جی تو کھل اٹھیں۔ کس شوق سے انہوں نے پاندان اپنی طرف سرکایا۔ کھول کر گیلے کپڑے میں تہہ کئے ہوئے پانوں میں سے ایک پان نکالا احتیاط سے لگایا ' اور منہ میں رکھ لیا۔ اب کہیں جاکر جان میں جان آئی۔ پھر انہوں نے سروطہ نکالا اور تھوڑی چھالیاں۔ کلے میں پان ہاتھ میں سروطہ ' سروطے کی بیچ چھالی۔ اماں جی اب کتنی آسودہ نظر آرہی تھیں۔

تھوڑی دیر میں باس اور نمبر۲ دونوں سٹور سے نکل آئے۔ باس نے کلائی پر بندھی گھڑی دیکھی "کامریڈ ہم جلدی نبٹ گئے"۔

ہاں وہ جلدی ہی نبٹے کسی قسم کی مزاحمت جو نہیں ہوئی۔ بیگم اور بیٹی دونوں ہی نے بہت خاموشی سے اپنے اپنے زیور اتار کر ان کے حوالے کر دیئے تھے۔ بیٹے کو بھی خیریت اسی میں نظر آئی کہ جس جس شے کا پتہ پوچھتے ہیں انہیں بتا دو۔ سیف کی چابیاں بغیر کسی حیل وحجت کے ان کے حوالے کر دی گئیں۔ بیگم نے چابیوں کا پورا گچھا تکئے کے نیچے سے نکال کر یوں دیا جیسے سر پہ بوجھ تھا کہ اتار کر فراغت پائی۔

"وین کس وقت آئے گی"۔ نمبر۲ نے پوچھا

"اس کے آنے میں تو ابھی خاصا وقت ہے۔ پہرہ بدلنے کے وقت کی ٹھہری تھی"۔

"پہرے والوں سے بات کرلی ہوتی تو ہم جلدی جا سکتے تھے"۔

"بات کی تھی۔ سالے بہت ڈیمانڈ کر رہے تھے۔ میں نے کہا کہ جاؤ سالو ' ہمیں تمہاری مدد نہیں چاہئے"۔

"باس پھر اتنی دیر کیا کریں گے"۔

"ہاں واقعی بہت بور ہونا پڑے گا"۔ رکا۔ پھر بولا "ہاں ایک پروگرام ہو سکتا ہے"۔

"کیا؟"

"چائے ہو جائے"۔

"گڈ آئیڈیا"۔

باس نے ایک نظر بیگم پر ڈالی جو کب سے گم سم بیٹھی تھی۔ "بیگم صاحب" اب اس

کے لہجہ میں بہت نرمی اور ساتھ میں شائستگی بھی آگئی تھی" آپ کو تھوڑی زحمت کرنی پڑے گی"۔ پھر نمبر۲ سے مخاطب ہوا" کامریڈ انہیں کچن میں لے جا کر کمپنی دو۔ چائے جلدی تیار ہونی چاہیے"۔

بیگم فوراً ہی اٹھ کھڑی ہوئیں۔ نمبر۲ نے پستول تانا اور بیگم کے پیچھے پیچھے کمرے سے باہر چلا گیا۔

تھوڑی دیر میں چائے بن کر آگئی۔ باس نے ایک پیالی بنا کر نوجوان ساتھی کی طرف بڑھائی جو بدستور پستول تانے مستعد کھڑا تھا اس طرح کہ گھر کے سارے مکین اس کی کڑی نظر کی زد میں تھے۔

"کامریڈ، تھوڑا Relax ہو جاؤ اور چائے پی لو۔ کوئی خطرے کی بات نہیں ہے۔ یہ شریف لوگ ہیں۔ اور ہم موجود ہیں"۔

نوجوان نے چائے کی پیالی سنبھالی۔ اس کے ساتھ ہی کسی قدر ڈھیلا بھی پڑ گیا۔ لیکن چائے پیتے ہوئے جس طرح کڑی نظروں سے وہ مکینوں کو دیکھ رہا تھا اس سے پتہ چلتا تھا کہ اب بھی وہ پوری طرح چوکس ہے۔

بہرحال فضا میں وہ پہلا سا تناؤ نہیں تھا۔ چائے کی پیالیوں کی کھنکھناہٹ جیسے دہشت کے رنگ کو کاٹتی چلی جا رہی ہو۔ چائے چیز ہی ایسی ہے۔ چائے کی پیالی ہاتھ میں تھام کر آدمی تنا ہوا نہیں رہ سکتا۔ تو جیسے چائے کی پیالیوں کے ساتھ کوئی نیا عنصر فضا میں سرایت کر گیا ہو۔ فضا میں تبدیلی کا پہلا اثر اس طرح ظاہر ہوا کہ لڑکی نے جو اب تک سہمی سہمی گم سم بیٹھی تھی سسکیاں لے کر رونا شروع کر دیا۔ ساری نظریں ایک دم سے اس پر مرکوز ہو گئیں۔ باس نے حیرت سے اسے دیکھا۔ دیکھتا رہا۔ پھر اماں جی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا" یہ کیوں رو رہی ہے"۔

"بیٹے وہ اپنی تقدیر کو رو رہی ہے"۔ اماں جی نے افسردگی سے جواب دیا۔ پان چباتے ہوئے سروطے سے چھالیاں کترتے ہوئے وہ کسی قدر آسودگی محسوس کر رہی تھیں۔ لیکن نواسی کو اس طرح سسکیاں لے کر روتے دیکھ کر وہ افسردہ ہو گئی تھیں

"تقدیر کو؟ کیا ہوا اس کی تقدیر کو؟" باس نے پھر اسی حیرت سے پوچھا۔

"اے ہے کچھ ہوا ہی نہیں بخت مارو خدا کے خوف سے ڈرو۔ تم نے اس غریب کی منگنی کی انگوٹھی ہتھیالی۔ اور پوچھ رہے ہو کہ کیا ہوا۔ بیٹے یہ سونے چاندی کی بات نہیں ہے۔ اس کے لئے ہم نہیں روئیں گے ۔ سمجھ لیں گے کہ جانوں کا صدقہ تھا چلا گیا۔ مگر یہ تو شگن کی بات ہے"۔ پھر لڑکی سے مخاطب ہوئیں۔ "بیٹی آنسو پوچھ لے۔ صبر کر"۔

باس کچھ سٹپٹا سا گیا۔ پھر نمبر۲ سے مخاطب ہوا "کامریڈ' اس کی انگوٹھی واپس کر دو"۔

اب نمبر۲ کے سٹپٹانے کی باری تھی۔ بات بناتے ہوئے بولا "ڈھیر میں کہیں رلی ملی ہو گی۔ بہت ٹٹولنا پڑے گا"۔

"کوئی بات نہیں ۔ٹٹولو اور واپس کرو"۔

نمبر۲ نے لاچار زیورات کی گٹھری کھولی۔ کتنی دیر تک ٹٹولتا رہا۔ باس کی نظریں اس پر جمی ہوئی تھیں۔ اس کی نظروں کی تاب نہ لاکر آخر اس نے انگوٹھی برآمد کی اور باس کے حوالے کر دی۔ باس نے انگوٹھی لے کر لڑکی کے حوالے کی اور بہت نرمی سے بولا "لے بی بی اپنی انگوٹھی پہن لے"۔

اماں جی نے اس واقعہ کو اپنی فتح شمار کیا۔ سو اب وہ زیادہ اعتماد کا مظاہرہ کرنے پر آمادہ نظر آ رہی تھیں۔ اور ادھر ان نوواردوں کا موڈ بھی تو اچھا خاصا بدل چکا تھا۔ چائے کا تو جو اثر ہوا وہ ہوا مگر لڑکی کے رونے نے تو جیسے فضا کو بالکل ہی بدل دیا ہو۔ نہیں بدلا تھا تو وہ نوجوان جس کی نقل و حرکت بتا رہی تھی کہ باس کی مشفقانہ ہدایت کے باوجود وہ اسی طرح اکڑا ہوا ہے ۔ سو جب اماں جی نے اپنا نیا سوال اٹھایا تو وہ پھر پہلے کی طرح تن گیا۔

اماں جی نے سادگی سے پوچھا "اے بیٹو' برا مت ماننا ویسے تم جاؤ گے کس وقت"۔

نوجوان نے تیزی سے پیالی میز پر رکھ پستول تان لیا "خاموش" سب گم سم چہروں پر بجلی ایسی دوڑتی نظر ڈال کر "کوئی اپنی جگہ سے ہلا تو گولی مار دوں گا"۔

اس تنبیہہ کا اثر اس مرتبہ پہلے سے بھی کم ہوا۔ اماں جی تھوڑے تلخ لہجہ میں بولیں "اے بخت مارے ہوش کی دوا لے۔ تو تو میرے حلق کا داروغہ بن گیا"۔

باس نے نوجوان کو متانت سے ٹوکا" کامریڈ' کوئی خطرے کی بات نہیں۔ اماں سے مجھے بات کرنے دو"۔ اس کے لہجہ میں کتنی تبدیلی آگئی تھی کہ جسے اس نے پہلے بڑھیا کہا تھا اب اماں کہہ رہا تھا۔ اماں جی سے مخاطب ہوا" اماں جی' آپ کیا چاہتی ہیں"۔

"اے بیٹا' میں کیا چاہتی۔ مجھ کال کھاتی نے بس اتنی سی بات پوچھی تھی کہ خیر سے تم کب جا رہے ہو۔ وہ بھی بیٹے میں نے اس لئے پوچھ لیا کہ میرے وظیفہ کا وقت قریب آرہا ہے۔ کہیں تمہارے چکر میں میرے وظیفہ میں کھنڈت نہ پڑ جائے۔ کھنڈت پڑ گئی تو غضب ہو جائے گا"۔

"غضب ہو جائے گا۔ کیا غضب ہو جائے گا"

"کیسے غضب نہیں ہو جاوے گا۔ معمولی عمل تھوڑا ہی ہے۔ جلالی وظیفہ ہے"۔

"جلالی وظیفہ؟" باس پھر چکرایا۔

"اے بیٹا کیا بتاؤں' ہمارے گھر میں تو پریشانیوں نے گھر کر لیا ہے۔ تو میں نے جلالی وظیفہ شروع کر دیا۔ جلالی وظیفہ سے سارے دلدر دور ہو جاویں ہیں۔ اب یہی دیکھ لو کہ ابھی وظیفہ شروع ہی کیا تھا کہ اپنی بچی کی منگنی طے ہو گئی۔ تو اللہ چاہے تو ہماری ساری پریشانیاں دور ہو جاویں گی۔ مگر بھیا یہ جلالی وظیفہ ہے جان جوکھوں کا معاملہ اگر کھنڈت پڑ جائے تو پھر تو قہر ٹوٹ پڑتا ہے۔ اس وظیفہ میں جنات سے سابقہ پڑتا ہے۔ اسی لئے تو میں پوچھ رہی ہوں' اپنے اور تمہارے دونوں کے بھلے کے لئے کہ میرے وظیفہ کے وقت تک خیر سے چلے جاؤ گے نا؟"

"اماں جی' آپ کا وظیفہ کس وقت شروع ہوتا ہے؟"

"بس ادھر مرغے بولے اور ادھر میں اٹھی۔ دو رکعت نماز فجر کی۔ اور اس کے بعد حصار باندھ کے وظیفہ کے لئے بیٹھ جاتی ہوں۔ حصار نہ باندھوں تو جنات تو مجھے کچا چبا جاویں"۔

باس سوچ میں پڑ گیا نمبر ۲ کی طرف دیکھا "کامریڈ' کیا اس سے پہلے ہم جا سکتے ہیں؟"

"باس ابھی اسی وقت جا سکتے ہیں"۔

"وہ کیسے؟"

باس نے معنی خیز نظروں سے نمبر۲ کو دیکھا۔ دونوں نے اشاروں میں تبادلہ خیال کیا

"اوکے"۔ باس نے کہا اور پھر فوراً پستول تان کر اماں جی کے بیٹے کے سر پہ جا کھڑا ہوا۔" دیکھیے ہم ابھی جانا چاہتے ہیں۔ مگر Conveyance اس وقت ہمارے پاس نہیں ہے۔ اپنی گاڑی کی چابی ہمارے حوالے کریں۔ واپس مل جائے گی آپ کو۔گاڑی ہم کسی کی نہیں لیتے"۔

اس شریف آدمی نے گاڑی کی چابی خاموشی سے اس کے حوالے کر دی۔ بس جھٹ پٹ وہ منتخب سامان جو چھانٹ کر الگ رکھا گیا تھا گاڑی میں لادا گیا۔ جب چلنے لگے تو باس اس کے پاس آیا کہا" دیکھیے پولیس کو اطلاع دینے کی کوشش مت کیجیے۔ اس سے آپ کو کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا۔ نقصان البتہ پہنچ سکتا ہے۔ آپ صبح کو اپنی گاڑی شالامار سٹور کے قریب سے Pick کر سکتے ہیں۔ چابی گاڑی میں ہوگی۔ کوئی غلط آدمی اسے نہیں چھیڑے گا۔ اوکے"۔ یہ کہہ وہ فوراً باہر نکل گیا۔

سب سے آخر میں نوجوان گیا۔ جاتے جاتے رکا۔ کچھ جھجکا پھر پلٹ کر اماں جی کے قریب آیا اور لجاجت سے بولا" آپ وظیفہ پڑھ رہی ہیں نا؟"

"ہاں بیٹا"۔

"اماں جی' بات یہ ہے کہ کل میرا انٹرویو ہے۔ اور اماں جی' آپ کو تو پتہ ہی ہے کہ اوپر سے نیچے تک سب سالے کرپٹ ہیں۔ رشوت کھاتے ہیں۔ تو رشوت چلتی ہے یا پھر سفارش ہو۔ میرے پاس دونوں میں سے کچھ نہیں ہے۔ تو اماں جی' وظیفہ میں آپ مجھے بھی یاد رکھیے۔ بس دعا کر دیں۔ میرا کام بن جائے گا"۔

نہ ہاں نہ ناں' بس اماں جی اسے تک رہی تھیں تھوڑی دردمندی کے ساتھ مگر پھر وہ رکا کہاں۔ یہ کہا اور عجلت سے باہر نکل گیا۔ اماں جی کتنی دیر تک اسی طرح گم سم بیٹھی رہیں۔ سروطہ ہاتھ میں چلتا رہا۔ پھر مرغے کی بانگ پر ہڑبڑا کر اٹھیں۔ وضو کرتے ہوئے بڑ

برائیں "بخت مارے"۔

※ = = = = = = = ※

داغ اور درد

ہر حیرت کی ایک معیاد ہوتی ہے۔ سو رفتہ رفتہ بات آئی گئی ہو گئی اور طلاق سے نئی شادی تک کا سارا ڈرامہ اپنی ڈرامائیت کھو کر برادری کے بھولے بسرے قصوں میں رل مل گیا۔ توقیر کی واپسی پر یہ سارا قصہ ایک نئی آب و تاب کے ساتھ حافظوں میں تازہ ہو سکتا تھا کہ لوگ ظالم ہوتے ہیں اور برادری کنبہ کی بڑی بوڑھیوں کا حافظہ کباڑ کوٹھری ہوتا ہے۔ جس میں دبے پڑے سات پشتوں کے قصوں قضیوں میں سے کوئی بھی قضیہ کسی بھی وقت ضرورت پڑنے پر برآمد ہو جاتا ہے۔ مگر ہوا یوں کہ زمانے بعد جب توقیر آئی تو ایک پھول سی بچی اس کی انگلی پکڑے پیروں چل رہی تھی اور ایک ستارہ سا بچہ گود میں ہمک رہا تھا۔ خود وہ سونے میں پیلی ہو رہی تھی۔ مختصر یہ کہ ہر پہلو سے بھاری تھی۔ ڈھکا چھپا تو ان کا اگٹا جاتا ہے جن کا پلہ کسی طور ہلکا ہو۔ بڑی بوڑھیوں کی بھی تو اپنی مصلحتیں ہوتی ہیں۔ وہ ایسی بن گئیں جیسے پہلے کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔ سب اس پر صدقے واری ہو رہی تھیں اور اونچ نیچ سمجھا رہی تھیں۔

"اے بنو، ایسے اٹھاؤ چولھا بنی کب تک دیس دیس پھرو گی آدمی کا کوئی ٹھور ٹھکانا تو ہونا چاہیے۔ اللہ رکھو آل اولاد والی ہو۔ بچی آج چھوٹی ہے کل سیانی ہو جائے گی۔ اور لڑکی تو بہت جلدی سیانی ہوتی ہے۔ تو اس کے بیاہ شادی کے لئے یہیں آکر بیٹھو گی۔ تو کوئی ٹھکانا تو ہونا چاہیے۔"

"توقیر بہنوں" چھموں نے ٹکڑا لگایا "ننھی تائی تمہارے بھلے کی کہہ رہی ہیں۔ اللہ قسم ایک مکان بنالو۔ ارے چھوٹی چھوٹی آمدنیوں والوں نے منزلیں کھڑی کرلی ہیں ۔ تمہارے لئے تو ماشے اللہ پیسہ ہاتھ کا میل ہے ۔ اس میل کو کہیں لگاؤ۔ ہمارا بھی جی چاہتا ہے کہ ہماری توقیر حویلی والی کہلائے۔"

"میں کہتی ہوں کہ آدمی کو ہمیشہ دور کی سوچنی چاہیئے"۔ ننھی تائی نے اپنی بات کی مزید وضاحت کی "آخر تمہارے دولھا کی کسی روز پنشن بھی ہو گی۔ پھر تو کہیں تھل سے بیٹھو گی ۔ کہیں کیا یہیں آکر رہو گی۔ تو آج اللے تللے ہیں۔ اس وقت پیسہ پکڑ کے خرچ کرو گی۔ اب جو کرلو گی اس وقت اس کا تمہیں فیض ملے گا۔ اور پیسہ تو آتا جاتا رہتا ہے مگر مکان تو کھڑا رہتا ہے"۔

بات کام کی تھی ۔ توقیر کے اندر اتر گئی۔ اگلے پھیرے میں زمین خرید کر ڈال گئی۔ پھر سال دو سال بعد آئی تو مکان کی تعمیر کا ڈول ڈال دیا۔ اور اس کے بعد اس کے پھیرے جلدی جلدی پڑنے لگے۔ اصل میں اب اس کا اپنے آپ میں اعتماد پوری طرح بحال ہو چکا تھا۔ کس ٹسے کے ساتھ وہ اپنے مکان میں آکر براجتی تھی ۔ برادری کے سارے قصے قضیوں میں اس طرح حصہ لیتی جیسے وہ مستقل وہاں رہ رہی ہو۔ اور اس کے بچے گلیوں میں اس طور کودتے پھاندتے پھرتے جیسے وہیں ان کی نال گڑی ہو۔ بلو اب اچھا خاصا بڑا ہو گیا تھا۔ گلیوں میں ڈنڈے بجاتے لڑکوں بالوں کے ساتھ گھومتا پھرتا۔ کبھی خالی پٹ کر کبھی ساتھ میں کپڑے پھڑوا کر گھر لوٹتا اور پھر توقیر کے ہاتھوں پٹتا ۔ مگر ایک روز ایک اور ہی رنگ سے خوار ہو کر روتا بسورتا گھر پہنچا۔

" کمبختی مارے ،کیا ہوا ۔ کیوں میری جان کو رو رہا ہے"۔

"میری ٹوپی"۔ بلو نے بسورتے ہوئے کہا۔

"کیا ہوا تیری ٹوپی کو"۔ اچانک سر پہ نظر گئی اور توقیر چلائی "ناس پیٹے ،نئی ٹوپی تھی۔ کہاں کھو آیا"۔

"وحیدا لے گیا"

"وحیدا لے گیا"؟

"ہاں اس نے میرے سر سے اچکی اور بھاگ گیا"

گھر میں سب ہنسنے لگے۔ توقیر بھی ہنس پڑی۔ اصل میں یہ تو وحیدا کا عام طریقہ واردات تھا۔ کسی کے سر پر ٹوپی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ ویسے اس کی دیوانگی کسی سے کچھ نہیں کہتی تھی۔ اپنے آپ سے باتیں کرتا، اپنے حال میں گم گلی گلی گھومتا پھرتا تھا۔ کسی کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی کم ہی دیکھتا تھا۔ لیکن جہاں کسی سر پر ٹوپی نظر آئی اس نے جھرجھری لی۔ ٹوپی اچکی اور یہ جا وہ جا۔ ایسا اڑنچھو ہوتا تھا کہ پتہ ہی نہ چلتا تھا کہ گیا کدھر چھوٹوں اور بڑوں کے کتنے سروں سے کیسی کیسی بانکی ٹوپی غائب ہو چکی تھی۔ اور کبھی سراغ نہ ملا کہ وحیدا ٹوپی کہاں جا کر چھپاتا ہے اور اس کا کیا کرتا ہے۔ کتنے بڑوں کے سروں پر بجی ترچھی بانکی ٹوپیاں غائب ہو چکی تھیں۔ چھوٹوں کا تو ذکر ہی کیا۔ بلو کی بالکل نئی ٹوپی تھی۔ توقیر نے کس چاؤ سے مخمل کی اس ٹوپی پر سلمہ ستارے ٹانکے تھے۔ اسے غصہ آنا ہی تھا۔ تاؤ کھا کر بولی کہ اسے ہیضہ کی کلی آئے، میرے لال سے اسے کیا دشمنی تھی کہ اس کی ٹوپی اچک کے لے گیا"۔ مگر جب اس نے دوسروں کو ہنستے دیکھا تو خود بھی ہنس پڑی اور بلو کو سمجھانے لگی "چپ ہو جا میرے لال۔ وہ تو دیوانہ ہے۔ دیوانوں کی کوئی کل سیدھی تھوڑا ہی ہوتی ہے۔ میں تجھے اس سے اچھی ٹوپی بنا کے دوں گی"۔

اصل میں توقیر کا رویہ بھی اب وحیدا کے سلسلہ میں وہی تھا جو باقی سب کا تھا۔ اب یہ کسے یاد تھا کہ وحیدا پہلے کون تھا، کیا تھا۔ شاید توقیر کو بھی نہیں اب تو یہی لگتا تھا کہ وہ سدا سے پاگل چلا آتا ہے اور یہ کہ پوری بستی میں اس کا کوئی عزیز رشتہ دار نہیں ہے۔ دیوانگی کا یہی کمال ہے کہ وہ آدمی کو رشتوں ناطوں کے جھمیلے سے رہائی دلا دیتی ہے۔ تو اب وحیدا صرف اور محض پاگل تھا۔ لوگوں کے بیچ مگر لوگوں سے بے تعلق۔ لوگ اس سے بے تعلق تھے۔ پہلے کوئی تعلق ہو گا مگر کب اور کیسے کسی کو یاد نہیں تھا۔ یاد کرنے کا خیال بھی نہیں آتا تھا۔ بس اب تو اسی واسطے تعلق رہ گیا تھا کہ کسی کی ٹوپی اچکی جاتی لیجیو دوڑیو ہوتی۔ جب اس کا پتہ نہ ملتا اور ٹوپی برآمد نہ ہوتی تو یہ سوچ کر صبر کر لیا جاتا کہ پاگل ہے

'کیا کیا جائے- توقیر نے بھی یہی سوچ کر صبر کر لیا- اور پھر چند ہی دنوں بعد تو توقیر واپس چلی گئی تھی-

ڈیڑھ دو سال بعد جب توقیر پھر آئی تو یہ واقعہ نہ بلو کو یاد تھا نہ توقیر کو - تھا ایسا کونسا بڑا واقعہ کہ یاد رہتا- ایک ٹوپی ہی کی تو بات تھی ' آئی گئی ہو گئی - ویسے بھی اس مرتبہ توقیر کی مصروفیت بہت تھی- بیٹی کی شادی سر پہ سوار تھی- برادری کی بڑی بوڑھیوں نے اسے صحیح سمجھایا تھا کہ لڑکی جلدی سیانی ہوتی ہے- آج چھوٹی ہے کل بڑی ہو جائے گی- سو وہ ہو گئی تھی - اور اب اس کی شادی ہونے لگی تھی- شادی کی تاریخ طے ہو چکی تھی اور دوڑی چلی آ رہی تھی- اب دن ہی کتنے رہ گئے تھے- توقیر رات دن تیاریوں میں لگی رہتی تھی- منشی جی کہ توقیر کے گھر بار کے منتظم تھے دن رات ایک ٹانگ پہ کھڑے رہتے تھے- ویسے تو انہیں فرصت ہی رہتی تھی- توقیر کی کونسی لمبی چوڑی جائیداد تھی - ایک مکان ہی تو تھا - توقیر کی عدم موجودگی میں چبوترے پہ بیٹھے حقہ پیتے رہتے تھے- باقی گھر بھائیں بھائیں کرتا تھا- چند دنوں کے لئے جب توقیر آتی تو گھر آباد ہوتا اور منشی جی مصروف نظر آنے لگتے تھے- تھوڑے دن کی مصروفیت ہوتی - توقیر چلی جاتی تو پھر فرصت ہی فرصت تو اب پھر ان کی مصروفیت کے دن تھے- اب کے مصروفیت زیادہ تھی کہ گھر میں شادی کا کھڑاگ پھیلا ہوا تھا- ذرا سستی دکھاتے تو توقیر سے سخت وست سننی پڑتی تھی - گھر میں جب سفیدی ہو رہی تھی تو توقیر نے اندر باہر کے پھیرے لگا کر خود دیکھا کہ کام ٹھیک ہو رہا ہے - باہر کے حصے کا جائزہ لیتے لیتے وہ اس طرف بھی جا نکلی جہاں نوکروں کے کوارٹر کے نام پر ایک کوٹھری بنی ہوئی تھی- کوٹھری کے اندر جھانکا اور ٹھٹھک گئی - منشی جی کو آواز دی- منشی جی لپک کر آئے "جی بیگم صاحبہ"-

"منشی جی یہ کوٹھری کا کیا حال بنا رکھا ہے - کب سے صفائی نہیں ہوئی ہے- اتنے چیتھڑے گودڑے "- پھر ذرا رک کر ' کسی قدر حیران ہو کر "ٹوپیاں - اتنی ٹوپیاں - منشی جی یہ ٹوپیاں کیسی ہیں"-

منشی جی تھوڑا سٹپٹائے - پھر بولے " بس دھیدا کا یہ خبط تھا- پتہ نہیں کس کس کی

ٹوپی اڑا کر لایا تھا۔ پاگل نے ٹوپیوں ہی کا ڈھیر لگا دیا"۔ پھر اچانک انہیں احساس ہوا کہ توقیر پوچھے گی کہ اس پاگل کو کس سے پوچھ کر گھر میں گھسایا تھا۔ سو فوراً صفائی پیش کرنے پر اتر آئے۔ "غریب کو کہیں سر چھپانے کی جگہ نہیں تھی۔ اور اب کے جاڑا بھی ایسا پڑا ہے کہ اللہ کی پناہ میں نے سوچا کہ باہر پڑا رہا تو ٹھٹھر کے رہ جائے گا۔ رات کو آ کر سو جانے دو۔ ہمارا کیا لیتا ہے"۔ مگر منشی نے دیکھا کہ توقیر کے یہاں کسی ہمدردی کے اثر آثار نہیں ہیں۔ سو انہوں نے جلدی سے مضمون کو انتہا تک پہنچانے کی سوچی "مگر اس نے یہاں کونسا زیادہ وقت گذارا رات کو آکر پڑ رہتا تھا۔ اور وہ بھی آیا آیا نہ آیا۔ ویسے بھی زیادہ عرصہ تو نہیں گذارا۔ بیچارہ مر ہی گیا"۔

"مر گیا؟" توقیر تھوڑا ٹھٹھکی

"ہاں مر گیا"۔ منشی جی نے ٹھنڈا سانس بھرا" رات کو کسی کسی وقت اس کے بنکارنے کی آواز آتی تھی۔ اس رات کوئی آواز نہیں آئی۔ صبح ہوئی تو مرا پڑا تھا۔ بیچارہ"۔

اسی گھڑی اندر سے بلاوا آگیا کہ ننھی تائی بلا رہی ہیں ننھی تائی شادی کے کاموں میں سب سے بڑھ کر ہاتھ بٹا رہی تھیں توقیر سنتے سنتے بڑبڑائی اور فوراً چل پڑی جاتے جاتے ہدایت کی تھوڑی نرمی کے ساتھ "جھمیا سے کہو کہ یاں آکے جھاڑو دے۔ اور چونا اچھی طرح پھروائیں"۔

"جی بیگم صاحب"۔

توقیر نے ادھر اندر قدم رکھا ادھر ننھی تائی نے اسے آڑے ہاتھوں لیا"اے بیٹی توقیر میں پوچھوں ہوں کہ تمہارا کیسا انتظام ہے۔ کسی کو کسی بات کا، کسی چیز کا پتہ ہی نہیں ہے۔ ایسی بدانتظامی رہی تو میں بتائے دیتی ہوں وقت آنے پہ تم بغلیں جھانکو گی اور برادری میں تھڑی تھڑی ہو جائے گی۔ بیٹی کی شادی ہے ہنسی ٹھٹھا تو نہیں ہے۔ بڑے انتظام کی ضرورت ہے۔ بیٹے والیاں کمبختی ماریاں بات کا بتنگڑ بناتی ہیں"۔

"ننھی تائی، میرا اکیلا دم ہے۔ کیا کیا کروں۔ جس کام کو نہ دیکھوں اسی میں کھنڈت پڑ جاتی ہے۔ قسم لیلو جو صبح سے ناشتہ کے نام منہ میں کھیل بھی گئی ہو۔ نہار منہ ایک ٹانگ

پہ پھر رہی ہوں"۔

"بی بی تم جانے کہاں پھر رہی ہو۔ میں یاں اپنی جان کو رو رہی ہوں۔ ابٹنا ہوتا تو لڑکی کو مائیوں بٹھا دیتی۔ جس سے پوچھتی ہوں وہ ٹکا سا جواب دیدیتی ہے کہ ہمیں تو پتہ نہیں ہے۔ ارے تمہیں پتہ نہیں ہے تو پھر کیا فرشتوں سے پتہ لیا جائے"۔

"ابٹنا"۔ توقیر نے ایسے کہا جیسے ابٹنے کی بات اس کے ذہن سے اتر چکی ہو اور اب ننھی تائی کے یاد دلانے پہ یاد آئی ہو "وہ تو میں نے مجیدن کے ذمے یہ کام لگایا تھا۔ مجیدن ہے کہاں"۔

"وہ تو مجھے کہیں دکھائی نہیں دے رہی"۔

"ارے مجیدن کہاں ہے"۔ توقیر نے شور مچانا شروع کیا

"ابھی نہیں آئی"۔

"کیوں نہیں آئی۔ گھر میں بیٹھی کیا کر رہی ہے"۔ اور یہ کہتے کہتے توقیر نے انور کی طرف دیکھا جو کرسی پہ دراز اطمینان سے اخبار پڑھ رہا تھا" اجی میں نے کہا کہ کچھ تم بھی تو ہاتھ پیر ہلاؤ۔ یہ اخبار تو بعد میں بھی پڑھا جا سکتا ہے"۔

انور نے اخبار سے نظریں ہٹائیں "کیا مسئلہ ہے"۔

"مسئلہ بعد میں سمجھتے رہنا"۔ توقیر بولی "ذرا منشی جی کو مجیدن کی طرف بھیجو۔ کہو کہ مجیدن سے جا کے کہیں کہ ابٹنا لے کے فوراً آئے۔ ابھی اسی وقت"۔

انور نے عینک اتار کر کیس میں رکھی۔ اخبار کو ایک طرف رکھا۔ اور باہر نکل گیا۔ تھوڑی ہی دیر میں واپس آیا "منشی جی ادھر جا رہے ہیں۔ ابھی اسے ساتھ لے کر آتے ہیں"۔ پھر کرسی پر بیٹھ کر اخبار اٹھاتے اٹھاتے ننھی تائی سے مخاطب ہوا" مگر ننھی تائی مائیوں کے سلسلہ میں اتنی کیوں عجلت ہے۔ کیوں غریب کو ابھی سے باندھ کر بٹھاتی ہو"۔

"اے لو، توقیر سن رہی ہو۔ یہ تمہارے دولھا کیا کہہ رہے ہیں" توقیر کو متوجہ کر کے فوراً انور سے مخاطب ہوئیں "انور میاں، تم اس زمانے کے آدمی ہوتا۔ ارے ہمارے زمانے میں تو پندرہ پندرہ دن پہلے لڑکی مائیوں بٹھا دی جاتی تھی، اس طرح کہ مجال ہے آسمان دیکھ

جائے۔ اتنا ابٹنا ملا جاتا تھا کہ سارے کپڑے پیلے ہلدی ہو جاتے تھے۔ اور جب دلہن بنتی تھی تو مہکتی تھی۔ آجکل کی طرح تھوڑا ہی کہ نگوڑیوں نے وقت کے وقت کسی فیشن کی دکان پر جا کے بناؤ سنگھار کروایا اور دلہن بن کے بیٹھ گئیں"۔

"اجی ننھی تائی"۔ توقیر بولی "تم ان کی باتوں پہ مت جاؤ۔ انہیں ریت رسموں کا کیا

"گھر میں ماشے اللہ پہلی شادی ہے نا۔ بس اس کے ساتھ سب پتہ چل جائے گا"۔

ننھی تائی کا بیان جاری تھا کہ توقیر اٹھ کھڑی ہوئی۔ اسے اچانک خیال آیا کہ دیکھنا چاہئے کہ جوڑے کتنے ٹنک گئے ہیں اور کتنے ابھی ٹنکنے باقی ہیں۔ وہ لپک جھپک اس کمرے میں پہنچی جہاں جوڑے ٹانکے جا رہے تھے۔ جائزہ لیا ہدایات دیں اور پھر فوراً وہاں سے نکل باورچی خانے کا رخ کیا۔ مہمان کچھ آن پہنچے تھے، کچھ کنبہ برادری کی بیبیاں جو تیاریوں میں ہاتھ بٹانے کے بہانے صبح سے رات تک یہاں اکٹھی رہتی تھیں۔ سو دستر خوان اچھا خاصا پھیل گیا تھا۔ اور اس کے ساتھ باورچی خانے نے بہت اہمیت اختیار کر لی تھی۔ غرضیکہ توقیر کی جان کے لئے سو دھندے تھے۔ اور آج تو وہ واقعی ایک ٹانگ پہ پھر رہی تھی۔ ایک ٹانگ یہاں ایک ٹانگ وہاں۔ کہیں رات گئے اسے کمر لگانے کی مہلت میسر آئی۔ اتنی تھکی ہوئی تھی کہ لیٹتے ہی سو گئی۔

لگتا یہی تھا کہ گھوڑے بیچ کر سوئے گی اور صبح تک سنائے گی۔ مگر اس کی تو بیچ رات ہی آنکھ کھل گئی اور اس طرح کھلی کہ آنکھوں سے نیند ہی غائب ہو گئی۔ جانے کونسا پہر تھا۔ شاید کہیں دور سے مرغے کی بانگ سنائی دے۔ اس کا اندازہ غلط نکلا۔ نہ مرغے کی بانگ نہ کسی کی کھانس کھنکار۔ گھر میں سب تھکے ہارے گھوڑے بیچ کے سوئے ہوئے تھے۔ سناٹے اور اندھیرے میں ذہن زقند بھر کہیں سے کہیں نکل گیا۔ ان دنوں جب ابھی وہ لڑکی بالی تھی اور خاندان کے ہر بالغ ہوتے لڑکے سے پردہ کرتی تھی۔ ادھر کوئی آیا ادھر وہ بجلی کی سی تیزی سے کمرے کے اندر۔ پھر وہ کواڑوں کی دراز سے آنے والے کو تھوڑا دیکھتی اور تجسس ختم ہو جانے پر پھر اپنی کروشیا چلانے میں منہمک ہو جاتی۔ وحید کو بھی پہلی مرتبہ اس

نے کنواڑوں کی درواڑ ہی میں سے دیکھا تھا۔ سوٹ بوٹ میں ملبوس ایک خوش شکل نوجوان اسکے تصور میں پھر گیا۔"یہ وحید ہے" وہ اسے دیکھ کر کتنی حیران ہوئی تھی۔ تھا بھی تو وہ خاندان کے باقی لڑکوں سے بالکل مختلف ' چال ڈھال میں ' تعلیم میں ۔ نیا نیا بی اے کر کے آیا تھا۔ پردیس سے اس کی ماں تو خاندان میں ہونے والی شادی غمی کی تقریب سے آتی رہتی تھی۔ وہ اپنی پڑھائی چھوڑ کر کیوں آتا۔ اب کے ماں اسے خاص طور پر ساتھ لے کر آئی تھی کہ پورا کنبہ دیکھ لے کہ اس کا لال بڑا ہو گیا ہے اور اس نے بی اے کر لیا ہے۔

"جیتے رہو بیٹے" اس کی ماں نے وحید کے سلام کے جواب میں کتنی دعائیں دی تھیں "افسر بنو۔ چاند سی دلہن بیاہ کے لاؤ۔ ماں باپ بہاریں دیکھیں"۔

اس دعا پر اس کا دل کتنا دھڑکا تھا اور کتنی دیر تک وہ کنواڑ کی درواڑ پر آنکھ چپکائے کھڑی رہی تھی۔ چاند سی دلہن ۔ چاند سا اس کا دولھا۔

میرا چھنک منک آیا بنڑاری
بڑی دوروں سے آیا بنڑاری

کب کی بھولی بسری دبی دبائی آواز کہاں سے ابھری اور اس پر چھاتی چلی گئی۔ پھر اس کا لوتھ بدن پلنگ پر تھا اور وہ کہاں کہاں پہنچی ہوئی تھی۔ بھرا گھر زرق برق پوشاکوں میں گہنے پاتے سے لدی پھندی بیبیاں۔ آوازے ' قہقہے ' بھانت بھانت کی بولی۔ اے بی ' ڈیوڑھی پہ پہنچو ' دولھا بس آنے کو ہے۔ ارے آخر کب آئے گا اے لو وہ تو وہ آرہا ہے ۔ بیبیو دولھا اندر آرہا ہے۔ ڈومینوں نے جھٹ ڈھولکی سنبھالی

میرا چھنک منک آیا بنڑاری
بڑی دوروں سے آیا بنڑاری

اے بی قرآن بیچ میں دھرو۔ کہاں سے دھروں ' رحل تو ہے ہی نہیں ...... کہو میاں وشہ بی بی آنکھیں کھولو' میں تمہارا غلام۔ ...."

"بی بی آنکھیں کھولو - میں تمہارا غلام"

""آنکھیں کھولیں؟"

"کھول دیں"۔

"جھوٹ - نہیں کھولیں- توقیر' آنکھیں مت کھولیو"۔

"وحید میاں' ہم تمہیں دلہن کو ایسے تو نہیں لے جانے دیں گے- سات دفعہ غلامی کا دم بھرو"۔

بی بی آنکھیں کھولو' میں تمہارا غلام - بی بی آنکھیں کھولو' میں تمہارا غلام - بی بی .... ککڑوں کوں- دور اسے مرغے کی بانگ سنائی دی- توقیر ہڑبڑا کر لیٹے سے بیٹھ گئی- ادھر ادھر دیکھا- اندھیرا - انور بے خبر پڑا خراٹے لے رہا تھا- بے سدھ بیٹھی رہی کچھ میں نہ آیا کہ کیا کرے- نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی- پھر اذان کی آواز آئی- نماز کا وقت آیا' بڑبڑائی اور پلنگ سے اتر کر باتھ روم کی طرف گئی-

ہاتھ منہ دھو کے' وضو کر کے واپس آئی اور چوکی پر جانماز بچھا کے نماز کے لئے کھڑی ہو گئی - کتنے زمانے بعد آج صحیح وقت پر صبح کی نماز پڑھ رہی تھی - فرض کے بعد دیر تک تسبیح پھیرتی رہی- پھر دونوں ہاتھ اٹھا کر دعا مانگی' سجدہ کیا اور جانماز لپیٹ کر رکھ دی- اب کیا کرے- ابھی پورا اجالا نہیں ہوا تھا اور کوئی ابھی تک نہیں جاگا تھا - چوکی پر بیٹھے بیٹھے پاندان قریب سرکایا- ایک کتر لگا کر منہ میں رکھی اور چھالیا کترنی شروع کر دی- خیالوں میں گم بیٹھی رہی ہاتھ میں سروطہ چلتا رہا- پہلا دورہ کب پڑا تھا' بس یوں ہی ایک خیال سا آیا مگر شاید اس کی مرضی کے خلاف کہ فوراً ہی رفع دفع ہو گیا- اور پھر وہی تصور ...... سوٹ بوٹ میں ملبوس' ہنس مکھ' کتنا اچھا لگ رہا تھا' کتنا کھل رہا تھا اس لباس میں ...... ماشاء اللہ چاند سا دولھا ملا ہے .... بی بی تمہارا وحید مقابلہ کے امتحان میں اول آیا ہے.......

"ارے' آج تم اتنی سویرے اٹھ بیٹھیں"- انور جاگ اٹھا تھا اور اس کے ساتھ اس کے تصور کی لڑی مرتب ہوتے ہوتے پھر بکھر گئی انور آنکھیں ملتا ہوا فوراً ہی اٹھ کر بیٹھ گیا-

توقیر کو بیٹھا دیکھ کر اسے تعجب ہو رہا تھا" تم رات سوئی بھی تھیں یا نہیں۔ جب تک میں جاگتا رہا ہوں اس وقت تک تو تم آئی نہیں تھیں۔ پتہ نہیں کتنی رات کو آکر لیٹ گئیں۔ اور پھر اتنی سویرے اٹھ کر بیٹھ گئیں۔ سوئی بھی تھیں یا نہیں'

توقیر نے بغیر جواب دیے اتنی بیگانگی کے ساتھ اسے دیکھا جیسے کوئی غیر مرد اس کی خلوت میں آن دھمکا ہو اور زبردستی اس سے مخاطب ہو۔ پھر سروطہ اور چھالیاں سنبھوا کر پاندان بند کیا اور اٹھ کھڑی ہوئی ۔ چلتے چلتے بے تعلقی سے انور کو دیکھتے ہوئے کہا "تم سوؤ"۔ اور کمرے سے نکل گئی۔

صحن میں خاموشی تھی اور خنکی میں رچا دھندلکا۔ صرف منڈیر پر زندگی کے آثار تھے جہاں ایک جنگلی کبوتر اور کبوتری گٹک رہے تھے۔ اس کے قدموں کی آہٹ پر چونکے ' گردن گھما کر دیکھا اور پھڑپھڑا کر اڑ گئے۔ اس نے برآمدے میں سوتے ہوؤں کو ایک بے تعلقی سے دیکھا اور صحن کو عبور کر کے مردانے میں نکل گئی۔

مردانے میں بھی خاموشی ہی تھی سوائے اس کے کہ سامنے والے نیم کی ٹہنیوں میں چھپی چڑیاں بہت شور کر رہی تھیں مگر اس کی توجہ کسی اور طرف تھی۔ پھر وہ اسی کوٹھری کے سامنے کھڑی تھی کل جس کا نقشہ ابتر دیکھ کر گئی تھی۔ اب نقشہ اور تھا توبیوں کی ڈھیری ' چیتھڑے گودڑے ' پھٹے پرانے جوتے ' دیواروں پر لگے جالے ' کوئلوں سے بنی کیلا کانٹی ' اب وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ جھاڑو دل گئی تھی اور دیواروں پر سفیدی ہو چکی تھی ۔ ایک بلی کونے میں دبکی بیٹھی تھی۔ اسے دیکھ کر پھریری لی اور تیزی سے اس کے برابر سے نکل باہر سٹک گئی۔ "بیگم صاب ' سفیدی ہونے کے بعد کمرے کی شکل نکل آئی"۔ منشی جی پیچھے کھڑے کھڑے بولے۔ وہ ایسی بے خبر کھڑی تھی کہ اسے پتہ ہی نہ چلا کہ وہ کس وقت اس کے پیچھے آکھڑے ہوئے تھے "بیگم صاب ' میں نے تو کل دیکھا۔ اس دیوانے نے کتنا کباڑ جمع کر رکھا تھا۔ بنجمیا کو فوراً بلایا اور جھاڑو۔ دلوائی ۔ سفیدی کے دو کوٹ ہو گئے ہیں۔ ایک کوٹ ابھی اور ہونا ہے"۔ منشی جی بولے جا رہے تھے اور وہ گم سم کھڑی تھی۔ ذرا جو ہنکارا بھرا ہو۔ جیسے کچھ نہ سنا ہو۔ کل یہاں کوڑا کرکٹ دیکھ کر دل برا ہوا تھا۔ آج سفیدی

اور صفائی دیکھ کر جی اداسی سے بھر گیا۔ تکتی رہی۔ پھر پلٹی اس طور کہ ہر قدم پر لگ رہا تھا کہ وہ ڈھینے لگی ہے نیم کی ٹہنیوں میں خاموشی تھی جیسے سب چڑیاں اڑ گئی ہوں۔ دھوپ مری مری سی منڈیر پر پھیلنے لگی تھی۔

❊ = = = = = = = ❊
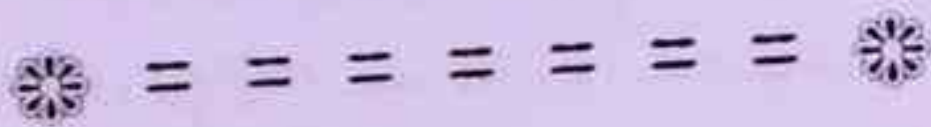
تذکرہ رستخیز بے جا المعروف بہ فسانہ عبرت

مدت مدید سے کمترین کی یہ آرزو تھی کہ زمانہ رستخیز بے جا کے حالات وکوائف بعد تحقیق کے یکجا کئے جاویں اور ایک مرقع عبرت اہل بینش کے لئے تیار کیا جاوے۔ احباب نے اس کام کو کار عبث بتایا۔ کہا کہ وہ دَور مانند حرفِ غلط کے تھا کہ مٹ گیا۔ تم غلط کو صحیح کیسے کروگے اور جس کے سارے نشان مٹ چکے ہوں اسے اجاگر کیسے کروگے پھر دور تو اور بھی ہیں۔ کیا ضرور ہے کہ اسی دَور کو اجاگر کیا جاوے جس میں اجاگر کرنے کی کوئی بات نہ ہو۔ آخر وہاں فخر کرنے کی کونسی جائے ہے۔ مگر بندہ اس دلیل سے قائل نہ ہوا۔ الٹا انہیں قائل کرنے کی سعی کی کہ عزیزو اور کچھ نہیں تو ہم اس دَور کو اپنی تاریخ کے ایک اعجوبے کے طور پر یاد رکھ سکتے ہیں۔ اور آدمی اپنی تاریخ کے اعجوبوں سے کیوں شرماوے کیوں نہ ان سے عبرت حاصل کرے۔ ایسا کہہ کر اور یوں سوچ کر اس بے ہمت نے کمر ہمت کسی اور اس دور کا تذکرہ لکھنے پر مستعد ہوا جس کا احوال سن کر صاحب دل گاہ ہنستے ہیں گاہ روتے ہیں۔

اس ہیچ مداں کو اپنے کام میں بڑی مشکل یوں پیش آئی کہ اس دور کے تذکرے علی العموم ناپید ہیں۔ اکا دکا دستیاب ہوا تو اردو میں تھا۔ اردو ایک زبان تھی جو دائیں سے بائیں لکھی جاتی تھی۔ اہل تحقیق شہر قدیم کی کھدائی سے پہلے ہی ایسی زبان کے موجود ہونے کا امکان ظاہر کر چکے تھے۔ مگر بوجہ ٹھوس شواہد مہیا نہ ہونے کے وثوق سے اس کے

بارے میں بات کرنے سے قاصر رہے۔ کھدائی کے بعد گذرے زمانے میں موجود اور مروج ہونا اس کا مسلم ٹھہرا۔ اس کھدائی میں اول اول ایسی اینٹیں برآمد ہوئیں جن پر یہ زبان کندہ پائی گئی۔ یہ اینٹیں موہنجوداڑو اور ہڑپا سے برآمد ہونے والی اینٹوں سے مختلف ہیں' ساخت کے اعتبار سے بھی اور استعمال کے اعتبار سے بھی۔ یہ اینٹیں اپنے زمانے میں دونوں کاموں کے لئے استعمال ہوتی تھیں۔ بنانے کے لئے بھی' توڑنے کے لئے بھی۔ ان سے عمارتیں بنائی جاتی تھیں اور کاروں کے شیشے توڑے جاتے تھے۔ ونیز بسوں کے۔ کاروں کے شیشے چکنا چور کر کے انہیں ان کے حال پہ چھوڑ دیا جاتا تھا۔ البتہ بسوں کو بعد اس کے جلا دیا جاتا تھا۔ مگر ان اینٹوں کا شاہکار ڈیڑھ اینٹ کی مسجد تھی۔ اس طرز میں عمارت اس طور کھڑی کی جاتی تھی کہ دیکھتے دیکھتے اینٹ سے اینٹ بج جاتی تھی۔ پھر نہ اینٹ رہتی تھی نہ اینٹ والے رہتے تھے۔

بعد اینٹوں کی برامد کے مزید کھدائی پر مخطوطات' ملفوظات' مطبوعات کے دفتر کے دفتر برآمد ہوئے کہ یہ شہر کسی زمانے میں کتب خانوں' درسگاہوں' اور چھاپے خانوں کا مرکز تھا۔ ان دفتروں کو دیکھ کر محققوں نے اپنے اپنے قیاس کے گھوڑے دوڑائے اور دور کی کوڑی لائے۔ پہلے اس شہر کے محل وقوع کا اندازہ لگایا۔ جہاں اب یہ شہر آباد ہے آگے یہاں گھنا جنگل تھا۔ جہاں قافلے دن دہاڑے لٹ جاتے تھے کہ یہ ڈاکوؤں کی آماجگاہ تھا۔ مگر پھر اس جنگل کی قید نہیں رہی۔ شہر کے بیچ اشراف لٹنے لگے ڈاکو دن دہاڑے بھرے بازاروں میں نمودار ہوتے۔ صرافوں بزازوں کو' بزاریوں بزاریوں کو اس رنگ سے لوٹتے کہ بس تن پہ کپڑے باقی رہ جاتے۔ ٹھوں ٹھاں کرتے ہوئے بنکوں مال خانوں میں داخل ہوتے اور تجوریاں خالی کر کے بعد اطمینان واپس جاتے۔ تو خیر شہر وہاں آباد تھا جہاں اب ویرانہ ہے اور جہاں تہاں تھوڑے اثر آثار ہیں۔ مخطوطات' ملفوظات' مطبوعات کے دفتر جو برآمد ہوئے ان کی زبان عجیب تھی۔ محققوں نے اس زبان کا سراغ لگایا اور ثابت کیا کہ یہ وہی زبان اردو ہے جو کسی بھلے یا برے وقت میں اس ملک کی قومی زبان قرار پائی تھی یا قرار پاتے پاتے رہ گئی تھی۔ چونکہ زمانہ رستخیز بیجا میں ہر وہ شے جو قومی قرار پائی تھی پہلے رسوا

ہوئی پھر کالعدم ہو گئی سو یہ زبان بھی کہ آگے مقبول و موقر تھی قومی زبان کے ٹھپے کے ساتھ پہلے رسوا ہوئی پھر معدوم ہو گئی۔ محققوں کا دوسرا گروہ اس خیال کا حامی ہے کہ یہ زبان قومی نہیں تھی۔ صرف رابطہ کی زبان تھی۔ مگر چونکہ رستخیزِ بیجا کے ہنگام قبیلے اور علاقے یہ کہتے تھے کہ رابطہ چہ کتی ست کہ پیش مرداں می آید اس لئے مردان بلند ہمت نے رابطہ کی دوسری صورتوں کے ساتھ اس صورت کو بھی دفع کیا اور رابطہ کے سب جھمیلوں سے آزاد ہو گئے۔

خیر تو میرے لئے لازم آیا کہ کسی نہ کسی طور اس زبان سے شناسائی حاصل کروں، مگر سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیونکر اس کالعدم زبان میں درک حاصل کروں۔ جوئندہ یابندہ، گھومتے پھرتے میری ملاقات ایک بزرگ سے ہوئی جس کے جدامجد اپنے وقت کے نامی گرامی پنواڑی تھے اور اس بستی کے مکین تھے جس کا نام کتب قدیم میں لالوکھیت لکھا ہے۔ اس بزرگ کو میں نے اس زبان سے آشنا پایا تو گویا گوہر مراد ہاتھ آیا۔ ہاتھ پیر توڑ کے، دنیا جہان سے منہ موڑ کے ان کی چوکھٹ پر بیٹھ گیا۔ اول اول اس بزرگ نے بہت نانو کی۔ عذریوں کیا کہ یہ ہمارا خاندانی راز ہے جسے افشا کرنے کی اجازت نہیں خاندان میں بھی صرف بزرگ خاندان کے پاس یہ علم بطور امانت ہوتا ہے۔ جب وہ مرنے لگتا ہے تو وارث کو پاس بلاتا ہے، کان میں کچھ پھونکتا ہے، سینہ سے سینہ ملاتا ہے اور پھر آنکھ بند کر لیتا ہے۔ اس طور اردو کا گنجینہ سینہ بسینہ منتقل ہوتا مجھ تک پہنچا ہے۔ اب خاندان میں جو مستحق ہے اسے دم آخر منتقل کروں گا۔ تجھ پر کہ غیر ہے کیسے اسے افشا کر دوں۔ مگر یہ خاکسار بھی ڈھیٹ نکلا۔ چوکھٹ اس کی نہ چھوڑی۔ جھڑکیاں کھائیں، چلمیں بھریں پر واں سے نہ ٹلا۔ آخر کے تئیں اس بزرگ کا دل پسیجا۔ سوچا کہ سائل کا جذبہ صادق ہے۔ اسے خالی ہاتھ واپس بھیجنا آئین مروت کے خلاف ہے۔ سو چار حرف اردو کے اس نے مجھے سکھائے کہ سینہ میرا اس علم سے معمور ہوا۔ پھر اس بزرگ سے اس گزرے زمانے کی تھوڑی باتیں اس طرح سنیں جس طور اس نے اپنے جد سے اور اس جد نے اپنے جد سے سنی تھیں۔ پھر ان تذکروں کو کہ کھدائی میں برآمد ہوئے تھے کھنگالا۔ الحمدللہ کہ بعد تحقیق

وتدقیق کے اب اس قابل ہوا ہوں کہ اس زمانے کے حالات جستہ جستہ بیان کروں اور بتاؤں کہ کیسا کیسا شخص قصرِ گمنامی میں گم ہوا۔

اس زمانے کے حالات عجب اور اشخاص غریب ہیں۔ اشیاء ایسی ایسی کہ لاکھ شواہد ان کے ہونے کے آج پیش کئے جاویں سننے والے کو مطلق یقین ان کے ہونے کا نہ آوے۔ اے عزیزو کیا تم باور کرو گے کہ اس زمانے میں ایسے پھول پائے جاتے تھے جن سے خوشبو آتی تھی۔ منجملہ ان کے ایک پھول تھا جسے چنبیلی کہا جاتا تھا۔ کیا اجلا اجلا مہکتا پھول تھا۔ مگر ہوا یہ کہ اسے قومی پھول قرار دیدیا گیا۔ بس پھر گلشن گلشن رسوا ہوا اور معدوم ہو گیا۔ اسی قبیل سے ایک پھول تھا جسے تذکرہ نویسوں نے موتیا لکھا ہے اس کے نصیب اچھے تھے کہ قومی پھول نہیں تھا۔ سو وہ ایک زمانے تک پھولتا رہا۔ اس پھول کا مہکنا محققوں کی نظر میں ثابت ہے۔ مگر یہ ابھی تحقیق طلب ہے کہ رنگ اس کا کیا تھا۔ تذکرہ نگاروں نے رنگ کا اس کے ذکر نہیں کیا مگر یہ ذکر کیا ہے کہ اس سے خوشبو کی لپٹیں نکلتی تھیں اور عورتیں اس کے گجرے بنا کر اپنے جوڑے میں گوندھتی تھیں۔ جوڑا کیا ہوتا ہے اسے لفظوں میں بیان کرنا مشکل ہے۔ جوڑا 'چوٹیا' دوپٹہ یہ اشیاء تفصیل طلب ہیں۔ میں سرسری اتنا بیان کروں گا کہ اس زمانے کی عورتوں کو عجب شوق یہ تھا کہ سر کے بال نہیں ترشواتی تھیں۔ سر کے بالوں کو اگر لپیٹ لیا جاتا تو وہ جوڑا کہلاتا اگر ابسیٹ دے کر پیچھے ڈال لیا جاتا تو اسے چوٹیا کہا جاتا۔ پرانے تذکروں میں ایسی عورتوں کی تصویریں علی العموم نظر آتی ہیں۔ لالو کھیتی بزرگ نے بیان کیا کہ اس نے اپنے جد سے سنا کہ انھوں نے اپنی آنکھ سے ایسی عورت کو دیکھا تھا جس کے بال اتنے لمبے تھے کہ اس نے انہیں بٹ کر اور بیچ اس کے ایک پھندنا پھنسا کر کمر پہ ڈال لیا تھا۔ ونیز یہ کہ اس نے ایک غایت باریک کپڑا سینے پہ اس دھج سے ڈال رکھا تھا کہ ان دو چاندوں کو چار چاند لگ گئے تھے۔ انلبا" یہی کپڑا دوپٹہ کہلاتا تھا۔

میں نے سطور بالا میں لالو کھیت کے بزرگ کو پنواڑی لکھا ہے۔ پنواڑی سے بھی سرسری تعارف لازم ہے کہ اس عہد کی معاشرت کے غریب رنگوں سے بھی ہماری شناسائی

ہو جاوے۔ میری تحقیق یہ کہتی ہے کہ پنواڑی پان بیچنے والے کو کہا جاتا تھا۔ اور یہ پان کیا ہے' اس پر میری تحقیق ابھی جاری ہے۔ اطبائے قدیم نے بے شمار جڑی بوٹیوں کا ذکر کیا ہے جن کے اپنے اپنے خصائص ہیں۔ مگر اس بوٹی کے خصائص محیرالعقول ہیں جنہیں قلمبند کرنے کے لئے ایک رسالہ درکار ہے بعد تحقیق کے ان سب خصائص کو حیطہ تحریر میں لاؤں گا۔ سردست یوں جانئے کہ یہ ایک قسم کا پتا تھا جو ایک سو ایک مسالوں میں لپیٹ کر کھایا جاتا تھا۔ اس کے کھاتے ہی زبان طوطے کی چونچ کی مثال لال اور طبع غزل میں رواں ہو جاتی تھی۔ سو جو پان کھاتا تھا وہ ابدا کر غزل بھی کہتا تھا۔ اور جو غزل کہتا تھا وہ پان بھی کھاتا تھا۔ گویا کہ پان کو غزل سے مفر نہیں تھا اور غزل طبع رواں سے زیادہ پان کی شرمندہ احسان تھی۔ پان اب عنقا ہے اور غزل گو نایاب ہے۔ دونوں ہی کو یوں سمجھو کہ زمانے کی بکری چر گئی۔ اس لئے آج کے لوگوں کو یہ بتانا پڑتا ہے اگرچہ بتانے پر بھی وہ نہیں سمجھتے کہ پان کیا نعمت تھی اور غزل گو کیا شے تھا۔ مگر اس زمانے میں دونوں کی افراط تھی۔ پنواڑی کوچہ کوچہ' غزل گو موج موج۔ اور لالو کھیت تو غزل گویوں سے پٹا پڑا تھا۔ اس دور کے ترچھے بانکوں کے بیچ وہ بھی اپنے آپ کو پانچویں سواروں میں جانتے تھے۔ مگر ان کی رانوں کے بیچ سے گھوڑا نکل گیا تھا۔ اس باعث انہوں نے پانچویں سوار کو بحسن وخوبی نئی لغت میں ترجمہ کیا اور اپنے آپ کو پانچویں قومیت کہنے لگے۔ بس پھر چل سو چل۔ بفضلہ تعالیٰ قومیت سے قومیت پیدا ہوتی چلی گئی۔

اس تذکرے کے سلسلہ میں جو مراحل میں نے طے کئے ان میں سب سے سخت مرحلہ یہی غزل کا ہے۔ بندہ کوتاہ قلم ہے اور غزل گویوں کی ایک فوج ظفر موج ہے پھر اور بھی تو رنگ رنگ کے شاعر ہیں جنہوں نے مضامین نو کے انبار لگائے ہیں۔ ان پر مستزاد نثر نگار کہ طرح بہ طرح کی نثر لکھی ہے اور گلشن قرطاس میں رنگ رنگ کے گل پھول کھلائے ہیں۔ کیونکر یہ دریا اس تذکرے کے کوزے میں بند ہو پاوے گا۔ مگر ہمت مرداں مدد خدا۔ یہی سوچ کر کمر ہمت باندھی ہے اور تذکرے پر جت گیا ہوں۔

اس صانع حقیقی کی صفت کے کیا کہنے کہ اتنی خلقت پیدا کی مگر کیا مجال کہ کوئی ایک

چہرہ دوسرے چہرے سے مل جاوے۔ یہی کیفیت اس عہد کے غزل گویوں کی تھی۔ غزل سب ایک سی لکھتے تھے مگر لتک سب کی الگ الگ تھی۔ رنگ رنگ کے پنچھی تھے' بھانت بھانت کی بولی بولتے تھے۔ ہاں ایک نعرہ مشترک تھا۔ یہ کہ ادیب کو جابر حاکم کے روبرو کلمہ حق کہنا چاہیے۔ مگر بقول احمد مشکوک یہی شے ان کے کلام میں عنقا تھی۔ احمد مشکوک اپنی طرز کے شاعر تھے۔ ایک تذکرہ بھی لکھا تھا جو اب ناپید ہے۔

فقیر نے اس تذکرے کے لئے بہت کتب خانے چھانے۔ کہیں دستیاب نہ ہوا۔ اگر وہ کبھی دستیاب ہو گیا تو اس زمانے کے سب ادیبوں کے چہرے بے نقاب ہو جاویں گے۔ بس ان کے کچھ اقوال جستہ جستہ ہم تک پہنچے ہیں۔ حالات زندگی جو میں تحقیق کر سکا ہوں یہ ہیں کہ اصلاً" لکھنوی تھے مگر پیدا ہوئے امرتسر میں۔ ہجرت کر کے لاہور پہنچے اور جہاں بیٹھ گئے سو بیٹھ گئے۔ ایک چائے خانہ کہ عہد قدیم کی یادگار تھا۔ ان کا تکیہ تھا۔ دن رات وہیں بیٹھے رہتے کبھی کبھی رنگ آسمان دیکھنے کی نیت سے باہر آتے اور فٹ پاتھ پر کھڑے ہو جاتے۔ سرمایہ داروں' افسروں' اور ان کے کاسہ لیس ادیبوں کی موٹروں کو فراٹے سے گذرتا دیکھتے۔ بس جلال میں آجاتے اور تکیئے میں واپس آکر چائے پیتے۔ غزل لکھتے لکھتے جوش حق گوئی میں نثر میں رواں ہو گئے ایک تذکرہ لکھنا شروع کیا جس میں عہد کے سارے منافق دانشوروں کا کہ سب ان کی تحقیق کے مطابق سی آئی اے کے ایجنٹ تھے۔ احول لکھا تھا۔ اصل میں وہ پہنچے ہوئے بزرگ تھے۔ اپنے کشف سے بدباطنوں کے باطن کو جان لیتے تھے اور چہرہ دیکھ کر نیت کا حال دریافت کر لیتے تھے۔ قوم کا احوال دیکھ کر گریہ کناں رہتے تھے اور افسوس کیا کرتے تھے کہ وائے ہو ان لوگوں پر کہ امریکہ کے دام تذویر میں گرفتار ہیں۔ افسوس کرتے کرتے ایک روز جلال آیا کہ گھر کو پھونک ڈالا۔ جب گھر کی ایک ایک چیز جل گئی دامن جھاڑ کر خاک سے اٹھے۔ بیوی بچوں کو ساتھ لے چل کھڑے ہوئے۔ اہل محلہ نے پوچھا کہ کدھر جاتے ہو۔ جواب دیا جہاں پوری قوم جاکر پیشانی ٹیکتی ہے۔ سوچا ہے کہ اسی سنگ آستاں سے جاکر سر پھوڑیں۔ یہ کہہ بستی سے کنارہ کیا اور نیویارک کے نرجن بن میں جاکر روپوش ہو گئے۔

احمد مشکوک کو استاد منصور سے تلمذ حاصل تھا۔ استاد منصور خوب بزرگ تھے۔ کبوتر بازی میں طاق ' غزل گوئی میں مشاق۔ کبوتر ان کی مٹھی سے نکل کر تارہ بن جاتا تھا ' شعر ہونٹوں سے نکل کر دل میں ترازو ہو جاتا تھا۔ ہر دو فنوں میں چوٹی کے استاد لوہا ان کا مانتے تھے ' مقابلہ میں آنے سے کتراتے تھے۔ مگر خوبیِ تقدیر سے یوں ہوا کہ کبوتروں کو بڈی چاٹ گئی ' غزلوں کا دیوان چوری ہو گیا۔ اس دہری چوٹ سے جانبر نہ ہو سکے۔ دنیا سے اس طور رخصت ہوئے کہ ترکہ میں نہ کوئی کبوتر چھوڑا نہ شعر۔

وہ زمانہ عجب تھا۔ سب ایک دوسرے سے لڑ رہے تھے۔ فرقہ فرقے سے ' علاقہ علاقے سے ' بھائی بھائی سے شاعر شاعر سے۔ کینہ پروری اور تہمت طرازی کا دور دورہ تھا۔ بھائی چارے کا فقدان تھا ' برادر کشی ہر قصے کا عنوان تھا۔ دو بزرگ کہ اپنے زمانے کے بکر اور تغلب تھے۔ دونوں کے اپنے اپنے فدائی تھے۔ جو پچاس برس تک دونوں کے درمیان صف آرائی رہی۔ قلم چلتے رہے اس شان سے کہ فریقین نے لکھ لکھ کر کشتوں کے پشتے لگا دیئے۔ شدید علی دوست الاشد من الموت۔ ان کی تلوار کبھی نیام میں نہیں گئی اور قلم کبھی رکا نہیں۔ تلوار سے خون اور قلم سے روشنائی ٹپکتی رہتی تھی۔ کہتے ہیں کہ جب وہ سو جاتے تھے تب بھی ان کا قلم چلتا رہتا تھا۔ سو بہت سے مضامین سوتے میں لکھے گئے مگر ایسے کہ ہر مضمون نے دشمنوں کی راتوں کی نیند حرام کر دی۔

اصل میں اس زمانے میں پیری مریدی کا بہت چکر تھا۔ سب سے بڑھ کر پیر شتابی تھے جن سے سلسلہ شتابیہ یادگار ہے۔ اہل منصب میں سے تھے۔ اس دور کی بساط پہ شاہ آتے رہے ' مات کھاتے رہے۔ مگر انہوں نے مات نہیں کھائی ' ترقی کے زینے پر چڑھتے چلے گئے۔ مگر پھر منصب سے جی پھر گیا۔ ایک روز بیٹھے بیٹھے خفقان ہوا۔ بولے کہ عزیزو ہم چلے۔ یہ کہہ کر غائب ہو گئے۔ بس کھڑاؤں ان کے رکھے رہ گئے۔ حالیہ برسوں کی کھدائی میں ایک باورچی خانہ برآمد ہوا ہے جس میں دو کھڑاؤں بہت سے ٹی وی سیریل کے مسودے اور ایک توا مٹی میں دبا پایا گیا۔ قرائن بتاتے ہیں کہ یہ وہی باورچی خانہ ہے جس میں بیٹھ کر ہما بانو ہنڈیا پکاتی تھیں اور ڈرامے لکھتی تھیں۔ جتنی دیر میں ہنڈیا دم میں آتی اتنی دیر میں

ایک ڈرامہ مکمل ہو جاتا۔ یہ سب پیر شتابی کے کھڑاؤں کی برکت تھی جو چولہے کے برابر بنے طاق میں سجے رکھے رہتے تھے۔ توے کے متعلق جاننا چاہئے کہ اول اول اس پر وہ چیز پکائی جاتی تھی جسے اس زمانے میں چپاتی کہتے تھے۔ جب غدر پڑا تو اسے سر پہ باندھا جانے لگا۔

منشی صفی اسی سلسلہ شتابیہ سے منسلک تھے۔ اوائل عمر میں فرائڈ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ کتنے زمانے تک جنسی نفسیات کی بے برکت وادی میں بھٹکتے پھرے۔ ایک دفعہ پیر شتابی کی قدم بوسی کا شرف حاصل ہوا۔ پھر اس چوکھٹ کو نہ چھوڑا۔ وہیں دھرنا مار کر بیٹھ گئے یہ سوچ کر کہ جو ملنا ہے یہیں سے ملے گا۔ پیر کے غائب ہو جانے کے بعد کتنے دن حالت الم میں رہے۔ ایک روز خواب میں ہدایت ہوئی تو اٹھ کر فوراً ہی قلم ہاتھ میں پکڑا اور ایک رسالہ لکھ ڈالا ملفوظات شتابیہ اس کا نام رکھا۔ پیر صاحب کی کرامات بالتفصیل اس میں قلمبند کیں۔ پھر ایک روز جلال آیا تو داستان امیر حمزہ بطرز جدید لکھنی شروع کر دی۔ دفتر پہ دفتر لکھتے چلے گئے۔ اتنے لکھے کہ داستان امیر حمزہ اس کے سامنے گرد ہو گئی اب نایاب ہے۔ روایت یہ ہے کہ جب غدر میں تلنگوں اور بدذاقوں نے ان کے گھر کو آگ لگائی تو جہاں سب کچھ جلا یہ داستان بھی جل گئی۔ کہتے ہیں کہ یہ داستان تین دن تین رات مستقل جلتی رہی۔

یقین کاندھلوی ہما بانو کے شوہر تھے۔ جوانی کے قیمتی سال افسانے لکھنے میں ضائع کئے۔ ہوش آنے پر اس کار عبث سے توبہ کی اور تبلیغی لٹریچر پروڈیوس کرنا شروع کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کاروبار میں برکت دی۔ ان کے تیارہ کردہ رسالوں کی مانگ بڑھتی چلی گئی۔ پیر شتابی سے بیعت تھے اور فرقہ ملامتیہ سے تعلق رکھتے تھے۔ خلقت سمجھتی رہی کہ یہ شخص سگ دنیا ہے۔ انہوں نے اس پردے میں سلوک کی منزلیں طے کیں اور سینہ نور عرفان سے بھر لیا۔ مگر بعض محققوں نے شک ظاہر کیا ہے کہ ان کا علم سفلی علم تھا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

ایک تھے گمنام سمرقندی مروے بوداز سمرقند مشاغل غزل کہنا اور گریہ کرنا۔ ایک روز روتے روتے شہر سے نکلے اور کربلائے معلیٰ کی طرف چل پڑے۔ مگر قدم بہکے اور وہ

لندن کے دشت حیرت میں جا نکلے۔ حوریانِ فرنگ کو دیکھ کر ہوش کا دامن ہاتھ سے چھوڑا۔ ایک حور شمائل کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ بس قیامت آئی ایک فیل پیکر دیو سیاہ نمودار ہوا۔ ایسا دھکا دیا کہ آنکھ کھلی تو اپنے آپ کو اپنی بستی میں اپنے خانہ ویراں میں پڑا پایا۔ آہ سرد کھینچتے تھے اور کہتے تھے' ایک دفعہ دیکھا ہے' دوسری دفعہ دیکھنے کی آرزو ہے۔ آدھی عمر گریہ میں بسر کی۔ باقی آدھی عمر ٹھنڈی آہیں بھرنے میں صرف کی۔

انہیں کے ایک ہمعصر اور عزیز دوست تھے قلندر فلکی ماہر فلکیات تھے و نیز شاعر۔ زندگی میں ایک ہی آرزو رکھتے تھے کہ کسی ایسے کو دیکھیں جسے وہ مسلمان کہہ سکیں۔ گمنام سمرقندی کے حال پر افسوس کیا کرتے تھے کہ ایک دوست ملا وہ بھی ایسا کہ شیوہ اس کا رفض ہے کل کلاں کو غیر مسلم اقلیت قرار دیدیا گیا تو اس کی نماز جنازہ سے بھی جاؤں گا۔ ایسے ہی کتنے غم تھے کہ انہیں کھا گئے۔ رکتے رکتے جنوں ہو گیا۔ ایک روز غزل پڑھتے پڑھتے اٹھ کھڑے ہوئے غزل کو چاک کیا۔ گھوڑے پہ سوار ہوئے اور جنگل کی طرف نکل گئے پھر کبھی شہر کا رخ نہیں کیا۔ کلام غدر میں تلف ہو گیا۔

اسی عہد میں ایک ہزار شیوہ شاعرہ بھی تھی۔ بھلا سا نام تھا' غیرت ناہید' فصیل کشور پاکستان' بلبل بستان اردو زبان' ہفت رنگ ہفت بیاں۔ ہر صنف ہر میدان میں رواں۔ نثر و نظم دونوں میں جاری۔ نثری نظم میں خوب ہنر دکھاتی تھیں۔ کوفتے کمال خستہ بناتی تھیں۔ ایسے کہ جس ادیب نے ایک دفعہ کھا لئے وہ ان کے دستر خوان کی مکھی بن گیا۔ باغیوں اور بیورو کریٹوں میں یکساں مقبول تھیں۔ ملحدین اور دیندار دونوں ان کے حلقہ مداحین میں شامل تھے۔

جامد کاشمیری مرد فضول بود۔ مشاغل عشق کرنا' کتابیں پڑھنا' یاروں کے خلاف کردار کشی کی مہم چلانا۔ یکمشت بہت سے شعر لکھ کر پوتھی دوستوں کے پاس امانت رکھ دی ساتھ اس وصیت کے کہ ہمارے مرنے کے بعد انہیں نذر آتش کر دینا۔ دوستوں نے اشارے کو سمجھا اور انہیں بصورت کتاب چھپوا دیا۔ یوں وہ صاحب دیوان بنے۔ عامل بھی تھے۔ روز رات کو اک عمل پڑھ کر سوتے۔ صبح کو اٹھتے تو تکئے کے نیچے سے دو روپے بصورت سکہ

رائج الوقت برآمد ہوتے - کہنے والے کہتے تھے کہ اس بزرگ کے پاس کالا علم ہے۔

سالم علی ' اسلم الرحمٰن ' سلیم الحق۔ نام میں اختلافات پایا جاتا ہے - بہرحال بھلا سا نام تھا۔ ہفت زبان تھے - صاحب طرز تھے - انگریزی چاسروالی اور اردو ملاوجہی والی لکھی شرفا ان کی تحریر پڑھتے تھے تو لغت ساتھ لے کر بیٹھتے تھے۔ کیا لکھتے تھے یہ تحقیق طلب ہے - ڈاکٹر میمن نے چند انگریزی افسانے اس دعوے کے ساتھ پیش کئے کہ یہ اس فاضل مصنف کے اردو افسانوں کے ترجمے ہیں - مگر وہ افسانے اردو میں نایاب ہیں - محققین جب اردو متن دریافت نہ کر سکے تو یہ شک ظاہر کیا کہ افسانے انگریزی میں خود ڈاکٹر موصوف نے لکھے ہیں اور ازراہ دوست پروری اس فاضل سے منسوب کر دیئے ہیں۔

عابد ساجد مرد عاشق پیشہ۔ کہانی میں معمہ لکھنے کا ہنر ایجاد کیا۔ معنی ان کی کہانی میں اس طرح نمودار ہوتے تھے جیسے کالی رات میں جگنو - ماہر جگنو پکڑ کر ٹوپی میں چھپاتے تھے اور خلقت کو دکھا کر حیران کرتے تھے۔

اسی دور میں سیتا ہرن بھی گذری ہیں جنہوں نے رامائن بطرز جدید لکھی تھی۔ طرز بیان کیا خواب تھا کہ سنسکرت اردو میں اور اردو انگریزی میں لکھی - چندے اس دیار میں رہیں۔ ایک روز لکشمن ریکھا سے قدم نکالا تھا کہ بھٹک گئیں۔ بعدہ دیار ہند میں دیکھی گئیں - جاتے جاتے اپنے زیورات اس دیار میں پھینک گئیں۔

منتخر جلالی سلسلہ جلابیہ سے تھے۔ نو طرز مرصع عرف نئے لسانی رابطے کے خالق۔ عبارت میں کوئی آسان لفظ آجاتا تھا تو پوری عبارت پر خط تنسیخ پھیر دیتے تھے۔ ایک نظم کا مطلب سمجھنے والوں نے سمجھ لیا تھا سو اسے انہوں نے دیوان سے خارج کر دیا۔ لوگ ان کے شعر سنتے تھے اور بوجہ نہ سمجھ پانے کے سر دھنتے تھے۔ جو سمجھ پاتے تھے وہ ان سے بھی زیادہ سر دھنتے تھے - آخر آخر میں ایک نئی زبان ایجاد کرنے کا سودا سر میں سمایا۔ پتلا بنا یا تھا۔ مگر پڑھا ہوا پانی چھڑکنے لگے تھے کہ آخری چلو پر بھٹک گئے۔ پانی چلو سے ٹپک گیا اور پتلا زندہ ہوتے ہوتے مردہ ہو گیا۔ بس اسی سے دماغ چل بچل ہو گیا۔ اول جلول بکنے لگے۔ سلسلہ جلابیہ والوں نے اسے ہی نئی زبان جانا اور اپنی نئی شاعری کے لئے ٹوٹکا گردانا۔

عالی گہر جمالی - جہاں آباد کے پری زادوں میں تھے۔ جب جہان آباد کا پانی کراچی کی سمت بہا تو وہ بھی بہہ کر اس دیار میں آ گئے۔ پنچھی پالنے کا شوق رکھتے تھے - مگر پنچھی ان سے وفا نہیں کرتا تھا۔ آنکھیں دکھاتا تھا اور اڑ جاتا تھا۔ محب وطن ایسے تھے کہ شاعری ترک کر کے قومی ترانے لکھنے شروع کر دیئے۔ مگر مرغی اپنی جان سے گئی کھانے والوں کو سواد نہ آیا۔ حب الوطنی کا تقاضا کرنے والوں نے ان کی حب الوطنی کی قدر نہ جانی۔ اس سے طبیعت میں یاس کا رنگ آ گیا تھا۔ لکھنے والے ادیبوں سے شاکی تھے - معذور ادیبوں کی مدد پر کمربستہ رہتے تھے۔

مقدر انقلابی شاعر تھے ' پھر انقلابی بن گئے۔ ان کی شاعری انقلاب کی نذر ہو گئی - انقلاب کو زمانہ کھا گیا۔ جہاں سے چلا کرتا تھا۔ وہیں کالی بلی نے اس کا رستہ کاٹا اور پوری عمارت اڑڑا دھم کر کے نیچے آ رہی۔ پتہ چلا کہ یہ کسی ساحر کا باندھا ہوا طلسم تھا۔ کسی حریف ساحر نے اس کے توڑ میں ایک کالی بلی پیدا کی اور اس سے رستہ کٹوا کر اس طلسم کو کاٹ دیا۔ اس سانحہ عظیم سے اس بزرگ نے ایسا اثر لیا کہ قنوطیت جسے آگے وہ کفر جانتے تھے ان کا شعار ٹھہری۔ افسوس کیا کرتے تھے کہ آدھی عمر اردو لکھنے میں ضائع کر دی آدھی عمر انقلاب کی حسرت میں صرف ہو گئی۔ یوں پوری عمر رائگاں گئی۔

ایک تھے میاں مستفسر تیزاڑ خیلی بعض محققوں نے انہیں مستغفر تراڑ خیلی لکھا ہے بعض نے مستشرق تارڈ اور بعض نے مستدرک تراڑی نئی تحقیق یہ کہتی ہے کہ اصل میں وہ مستعصم تراڑ خیلی تھے۔ اس نام نے بولنے والوں کے لئے گوناگوں مسائل پیدا کئے۔ اس واسطے سے نام نے شہرت پائی اور یہ بزرگ نامور ہو گئے۔ پاؤں میں چکر تھا۔ زمین کا گز بنے ہوئے تھے۔ سدا سفر کرتے تھے ' سفرنامے لکھتے تھے۔ حرکت میں برکت ہے - اللہ تعالیٰ نے ان کے قلم کو برکت دی تھی کہ انہیں کی طرح مستقل حرکت میں رہتا تھا۔ جتنے سفر کئے اس سے زیادہ سفرنامے لکھے سو سفر بے شمار - سفرنامے قطار اندر قطار - نقالوں نے اسے ادب پیدا کرنے کا نسخہ جانا اور گرہ میں باندھ لیا - جس نے زندگی میں ایک سفر کر لیا اس نے سفرناموں کے ڈھیر لگا دیئے۔ کسی کسی تن جلے نے یہ سوچ کر کہ اگر ہم سفر کی

سعادت سے محروم رہے تو کیا سفرنامے سے بھی گئے قلم اٹھایا اور ایسا ایسا سفرنامہ لکھا کہ میاں مستعصم تارڑ بھی خون تھوک گئے۔

نشیب وفراز خاں شاعر خوش بیاں۔ مشہور تراز شیطان۔ نابالغوں میں مقبول تھے۔ لڑکیاں ان کے اشعار کو مفید مطلب جانتی تھیں اور چن چن کر اپنے محبت ناموں میں ٹانکتی تھیں۔

مہاجر حسین المتخلص بہ ہجرتی۔ وطن مالوف کنکر کھیڑہ۔ مرد جاہل و متمکن بود۔ مسلمانی ان کی مشکوک حب الوطنی مشکوک تر تھی۔ افسانے لکھے مگر ثقہ نقادوں کو ان کے افسانے ہونے میں کلام تھا۔ ایک رات کنکر کھیڑے کو خواب میں دیکھا۔ صبح ہونے پر احباب سے کہا کہ عزیز و ہم رخصت ہوا چاہتے ہیں۔ پوچھا کیسے اور کہاں۔ کہا کہ اپنے وطن اور ایسے یہ کہہ آنکھ بند کر لی۔ ہمیشہ کے لئے۔

ناز نیازی۔ شاعر بے بدل۔ آدمی بے دماغ تھے کہ بس خود کو مانتے تھے ' دوسرے کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ شاعری کے جنگل میں شیر کی مثال رہے کہ اپنے جنگل میں دوسرے شیر کے وجود کو گوارا نہیں کرتا۔ منصوبے تیار کرنے میں ید طولی رکھتے تھے مگر افسوس کہ کہ ان کا ہر منصوبہ چوری ہو جاتا تھا۔ البتہ حلقہ ارباب ذوق کی فلک بوس عمارت کے منصوبے کو چور نے ہاتھ نہیں لگایا یہ منصوبہ جب تک ان کے پاس رہا وہ مرد خدا آفات ارضی و سماوی سے دوچار ہوتا رہا۔ لاچار ایک روز اس منصوبے کو آٹے میں گوندھ کر دریا برد کر دیا اور بقیہ عمر اطمینان سے بسر کی۔

تسلیم احمد۔ مرد آدھے اور شاعر پورے تھے۔ شعر بھی کہتے تھے مناظرے بھی کرتے تھے۔ مذہب کی حقہ کما حقہ تبلیغ کی۔ مگر شہرت ان کے احمد حلوے نے پائی۔

شاکرہ نازنین۔ نام خدا پری چہرہ تھیں۔ ہم خرما و ہم ثواب پروانے حسن بیان پر فریفتہ تھے۔ حسن صورت پر شیدا تھے۔

سرور مسرور۔ عورت تھیں۔ گواہی میں آدھی ' افسانے میں پوری تھیں۔

مشتے نمونہ از خروارے۔ ان چٹکی بھر چاولوں کو چکھو اور دیگ کا ذائقہ معلوم کر لو۔

مگر پھر یہ کم سواد سوچتا ہے کہ دیگ کا ذائقہ خالی ان دانوں سے کیسے معلوم ہو گا کہ یہ تو وہ لوگ ہیں جنہوں نے لکھنے میں عمر صرف کی اور ادبا کی صف میں مقام پیدا کیا۔ مگر اس دور میں متعدد ایسے ادیب نظر آتے ہیں جو اپنی ادبی شہرت کے لئے قلم کے شرمندہ احساں نہیں تھے۔ یہ نکتہ اس کم فہم کی سمجھ میں بہت خوار ہونے کے بعد سمجھ میں آیا۔ کتنے برسوں تک کتب خانوں میں سر پھوڑتا رہا' مخطوطوں کی چھان بین کرتا رہا۔ کچھ حاصل نہ ہوا۔ ان میں سے کسی کا دیوان کیا' ایک شعر تک دستیاب نہ ہو سکا۔ ہوا بھی تو پتہ چلا کہ یہ تو فلاں فلاں استاد نے لکھ کر اسے "تبرکاً" عطا کیا تھا۔ سنجیدہ نقادوں کے یہاں بھی ان کے کسی شعری یا نثری تحریر کا حوالہ نظر نہ آیا۔ مگر اس عہد کے اخباروں کے ادبی صفحوں پر ان کے نام نامی بمعہ تصویر نمایاں نظر آئے ٹی وی پروگراموں میں اس سے بڑھ کر نمایاں ۔ اور سب سے بڑھ کر ادبی انعامات کے اسمائے گرامی میں نمایاں۔

تحقیق وتدقیق کے بعد فقیر اس نتیجہ پر پہنچا کہ اس عہد میں ان ادیبوں نے جو زیور عقل سے آراستہ تھے لکھنے کو کار عبث جانا اور ادیب بننے کے جدید طریقے اپنائے۔ ان ادیبوں کو دو اقسام میں تقسیم کیا جا سکتا ہے ۔ دستخطی ادیب اور نمائشی ادیب۔

دستخطی ادیب وہ تھے جو اخباری بیانات پر دستخط کیا کرتے تھے۔ واضح ہو کہ اس زمانے میں ادیب لکھتے کم تھے' بیان زیادہ جاری کرتے تھے کہ جابر سلطان کے سامنے کلمہ حق کہنے کا یہ واحد طریقہ تھا جو انہوں نے دریافت کیا تھا ۔ میں نے ان بیانات کا بالاستیعاب مطالعہ کیا ہے اور بعد تحقیق کے ایسے مقتدر ادیبوں کی ایک جامع فہرست تیار کی ہے جن کے دستخط اس عہد کے ہر اخباری بیان پر ثبت نظر آتے ہیں۔ یہ بیانات اس عہد کا بڑا تخلیقی سرمایہ ہیں۔ جس نے اس پر دستخط کر دیئے اس نے اپنی بخشش کا سامان کر لیا۔ جو دستخط کرنے سے رہ گیا اس نے گویا کومٹ منٹ کے مسلک سے روگردانی کی اور حق سے منحرف ہو جانے والوں کے ساتھ محسوب ہوا۔

دستخطی ادیب محرومین میں شمار ہوتے تھے۔ مگر ایک مختصر سا دور ایسا آیا جس میں وہ انعام واکرام کے مستحق سمجھے گئے۔ اس دور کو چار دن کی چاندنی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے ۔

اس چار دن کی چاندنی میں ہر دستخطی ادیب اپنے دستخطوں کے فیض سے جمہوریت کا محافظ ادیب شمار ہوا اور انعامات سے سرفراز ہوا۔ اغیار کی لکھی ہوئی تاریخوں میں اس دور کے ذیل میں ایک خسر اور ایک شوہر نامدار کے حوالے دے دے کر عورت کی حکمرانی کے خلاف دلائل فراہم کئے گئے ہیں ۔ مگر بیگمات کے آنسو' کے مصنف نے اس دور کو ایک زریں دور سے تعبیر کیا ہے۔

نمائشی ادیب اخباری بیانات پر دستخط کرنے کے قائل نہیں تھے۔ ہاں اخباروں میں سہ رنگی تصاویر چھپوانے میں مضائقہ نہیں جانتے تھے۔ اپنے ساتھ شامیں منوانے کا اہتمام بالالتزام کرتے تھے۔ ٹی وی کے اشتہاروں میں بہت آتے تھے۔ حب الوطنی ان میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ اسلام کے شیدائی تھے ۔ اس کا دنیا میں بھی اجر پایا اور آخرت کو بھی سنوار لیا۔ تمغے اور خطابات سے ان کی طبیعت ابا کرتی تھی۔ مگر تمغے اور خطابات ان کا پیچھا کرتے تھے اور ہر برس بارش ابر کرم کی صورت ان پر برستے تھے ۔ نقیب الملۃ حضرت نقیب کلانچوی کی مثال سے یہ امر واضح ہے ۔ آپ نے جو قومی خدمات انجام دی تھیں ان کا ذکر اپنی زبان سے کبھی نہیں کیا طبیعت کو خود ستائی سے نفور تھا۔ مگر ایک حق گو محقق نے تحقیق کر کے آپ کی ملی وقومی خدمات کو اجاگر کیا اور بتایا کہ اپنے زمانہ کمسنی میں جب قیام مملکت کی تحریک عروج پر تھی تو آپ نے ایک جلوس میں شرکت کی تھی ونیز نعرہ لگایا تھا۔ اس واقعہ کے منظر عام پر آنے کے بعد آپ کو اس عہد کے سب سے بڑے ادبی انعام سے نوازا گیا۔ آپ نے اظہار تشکر کے طور پر حاکم وقت کی شان میں ایک نظم لکھی جسے سال کا بہترین شعری کارنامہ تسلیم کیا گیا اور انعام کا مستحق جانا گیا۔ کہتے ہیں کہ اس نظم کے علاوہ بھی انہوں نے از قسم نظم ونثر خامہ فرسائی کی تھی مگر وثوق سے کچھ کہنا مشکل ہے۔ بہرحال یہ ایک نظم ایسی ہے کہ پورے پورے دیوانوں پر بھاری ہے۔ دوسری مثال شرر پیامی کی ہے جنہوں نے ایک کالم اس باب میں باندھا کہ جمہور دوست عدل پرور صاحب سیف حاکم وقت نے سائیکل چلائی اور جب چوراہے پر پہنچ کر بتی کو سرخ پایا تو سائیکل کو بریک لگا کر کھڑے ہو گئے۔ نیز ٹریفک کے سپاہی سے ہاتھ ملایا۔ اس ایک کالم کو قبول عام شہرت دوام

کی سند ملی اور اسی ایک کالم کی بنیاد پر وہ اپنے دور کے سب سے بڑے نثر نگار مانے گئے اور سب سے بڑے ادبی انعام کے مستحق ٹھہرے۔ اس مبارک سائیکل اور اس کے سوار کی شان میں پھر بہت کالم باندھے گئے اور مضامین نظم و نثر لکھے گئے لیکن حق یہ ہے کہ سب نے شرر بیامی کا منہ چڑایا ہے' یہ الگ بات ہے کہ فیض بقدر ظرف سب نے حاصل کیا۔ مگر وہ جو مولوی مدن والی بات تھی وہ پھر کسی تحریر میں نہ آئی۔

یہ حاکم اپنے وقت کا خوب تھا۔ خوب تو خیر اس دور کے سب ہی حاکم تھے' وہ بھی جو اس سے پہلے گذر گئے وہ بھی جو اس کے بعد آئے آگے ایک حاکم گذرا تھا کہ چھ مہینے سوتا تھا چھ مہینے جاگتا تھا۔ احکامات سوتے میں جاری کرتا تھا۔ بیداری کے ایام چوسر کے لئے وقف تھے۔ ایک دفعہ یوں ہوا کہ ابھی سویا تھا کہ غنیم نے حملہ کر دیا۔ تخت کے وفادار اطلاع دینے کے لئے پہنچے۔ مگر خدام ادب بولے ابھی آنکھ لگی ہے۔ آپس کی تکرار میں اس کی آنکھ کھل گئی۔ شور کی وجہ پوچھی۔ وفاداروں نے عرض کی کہ حضور غنیم چڑھ آیا ہے' سلطنت میں خلل پڑ چکا ہے۔ کہا پھر نیند میں خلل ڈالنا کیا ضرور تھا۔ عرض کیا کہ آدھی سلطنت ہاتھ سے نکل چکی ہے۔ کہا کہ آدھی تو باقی ہے نا۔ اور پھر سو گیا۔

اگلا جو حاکم آیا وہ خوب تر تھا۔ روشنی طبع سے مالا مال تھا کہ افلاطون دوراں کیسے تو بجا ہے۔ بیگمات کے آنسو کے مصنف نے اس کے حالات بیان کرتے ہوئے بتایا ہے کہ اصل میں وہ خوق الانسان تھا اور بڑے خواب دیکھتا تھا۔ ایک شب خواب میں دیکھا کہ سفید براق گھوڑے پر سوار ہے ہاتھ میں شمشیر براں ہے۔ صفیں چیرتا ہوا لال قلعہ کی فصیل پر چڑھ جاتا ہے اور اپنے ہاتھ سے اس پر پرچم لہراتا ہے۔ اس خواب نے اسے ایک ولولہ تازہ عطا کیا۔ پر حیف کہ عمر نے وفا نہ کی ایک دفعہ سالار اعظم نے اپنے خفیہ سلسلہ سے معلوم کیا کہ داروغہ مطبخ نے سازش کی ہے۔ گھوڑا دوڑاتا ہوا محل میں پہنچا۔ دسترخوان بچھ چکا تھا۔ جب اندر اس نے قدم رکھا تو دیکھا کہ سلطان عالی نوالہ شوربے میں تر کر کے منہ میں رکھا چاہتے ہیں۔ آگے بڑھ کر نوالہ ہاتھ سے چھینا اور فوراً ہی پاس بیٹھی بلی کے سامنے ڈال دیا۔ بلی نوالہ کھاتے ہی فی الفور مر گئی تب سالار اعظم نے سازش سے آگاہ کیا۔ سلطان

عالی نے عالم غیظ میں داروغہ مطبخ کو طلب کیا۔ کہا کہ مرغابن جاؤ۔ وہ مرغا بن گیا۔ فرمایا کہ کان پکڑو۔ اس نے کان پکڑے۔ حکم دیا کہ دیوار کی طرف منہ کر کے کان پکڑ کے کھڑے ہو جاؤ۔ وہ دیوار کی طرف منہ کر کے کان پکڑ کے کھڑا ہو گیا۔ جب سزا پوری ہوئی تو داروغہ مطبخ پیروں پہ گر پڑا۔ گڑ گڑا کر کہا جاں بخشی کی جائے۔ از راہ ترحم فرمایا کہ جاؤ تمہاری جان بخشی ۔ آج سے تم ہمارے سالار اعظم ہو۔ سالاراعظم سے کہا کہ اب تم ہمارے داروغہ مطبخ ہو۔

وزیر باتدبیر نے دست بستہ عرض کی کہ سلطان عالی' سالاراعظم کو داروغہ مطبخ بنانے کی لم سمجھ میں نہیں آئی۔ فرمایا کہ جو شخص ہمارے ہاتھ سے نوالہ اچک سکتا ہے وہ سلطنت بھی چھین سکتا ہے۔ وزیر باتدبیر نے عہدے کی تبدیلی کی حکمت کو جانا اور داد دی ۔ مگر پھر عرض کیا کہ جس موذی نے آپ کی جان لینے کی سازش کی اسے جان سے مارنے کی بجائے اور ترقی دیدی۔ فرمایا کہ سازش سے ہم نے جانا کی کمبخت نے ذہن رسا پایا ہے ۔ کیا عجب ہے کہ جو کام ہم سے رہ جائیں انہیں وہ پورا کرے۔ اور ایسا ہی ہوا۔ سالاراعظم بن کر پہلے اس نے سلطان عالی کا کام تمام کیا ۔ پھر تخت پر بیٹھ کر کچھ سلطان شہید کے چھوڑے ہوئے کام پورے کیے کچھ نئے کام ایجاد بندہ کے طور پر سوچے اور انجام دیے۔

یہ حاکم اپنے کارناموں میں سب پچھلوں سے سبقت لے گیا۔ اس نے بھی ایک خواب دیکھا تھا کہ جیسے سمرقند وبخارا اس کے سامنے سرنگوں ہیں اور وہ کھوپڑیوں کا مینار کھڑا کر کے فتح کا ڈنکا بجا رہا ہے۔ مگر کمبخت عمر نے اس کے ساتھ بھی وفا نہیں کی۔ واقعہ یوں ہے کہ اس دیار کے ہر حاکم نے کوئی نہ کوئی خواب ضرور دیکھا۔ مگر ہوا یہی کہ تعبیر میں جب ابھی ایک آنچ کی کسر ہوتی تھی تو یا تو قطامۂ عمر نچہ دے جاتی تھی یا یہود وہنود کی سازش کام دکھا جاتی تھی ۔ خیر تو اپنے کارناموں کی بدولت وہ سب پچھلوں کو پیچھے چھوڑ گیا ۔ خلیفہ ہارون رشید کو بھی۔ بھیس بدل کر سائیکل پر بیٹھ کر بازار میں نکل جاتا۔ سائیکل کمال چلاتا۔ ہاتھ سب سے ملاتا۔ اس کے وقت میں مسلمانوں کے تنتر فرقے خوب پروان چڑھے۔ ہوتے ہوتے ایسے صاحب ایمان پیدا ہوئے جنہوں نے کفر کا تعاقب کرتے کرتے خود مسلمانوں کے

اندر کافر دریافت کرنے شروع کر دیئے۔ پتہ چلا کہ پورے پورے فرقے کفر کے گڑھے میں اور قصرِ مذلت میں پڑے ہیں۔ انہیں ایک ایک کر کے غیر مسلم اقلیت قرار دیا سو آخر کے تیئں یہ ہوا کہ غیر مسلم اقلیتیں اکثریت میں تھیں اور مسلم اکثریت اقلیت میں۔ مگر اسی اقلیتی اکثریت کے بیچ استاد قلندر فلکی بھی تھے کہ بصد حسرت ویاس کہا کرتے تھے کہ اے کاش میں اپنی زندگی میں کوئی ایک مسلمان دیکھ لیتا۔ آخری وقت میں وصیت کی کہ میرے یار عزیز گمنام سمرقندی کو میری نماز جنازہ میں شریک ہونے سے نہ روکا جاوے استدلال یوں کیا کہ جب سب ہی کی مسلمانی مشکوک ہے تو کسی ایک پر اور وہ بھی ایسے پر جو میرا یار غم خوار ہے کیوں انگلی دھری جاوے اور کیوں اسے اس فقیر کی نماز جنازہ سے روکا جاوے۔ مرنے کے بعد پسماندگان میں وصیت کے باب میں اختلاف پیدا ہو گیا۔ ارباب فہم نے بجا کہا کہ بندہ خدا عمر بھر زہد واتقا کی راہ پر گامزن رہا۔ وصیت ایسی کر گیا کہ ساری عبادت پہ پانی پھر گیا۔

اس زمانے میں پاک بازی پر اصرار تھا۔ فحاشی کے خلاف مہم تیز تھی۔ نقش نگار اور عریانی پرست ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالے جاتے تھے۔ گردنیں ان کی ناپی جاتی تھیں۔ ایک کج ذہن اس بناء پر کہ گلستان' کا باب پنجم پڑھتے ہوئے پایا گیا تھا معتوب ہوا۔ البتہ گینگ ریپ کے باب میں ارباب فہم خاموش رہنا پسند کرتے تھے اس حکیمانہ عذر پر کہ بندہ بشر ہے بھول چوک سے بنا ہے۔ گینگ ریپ کے بارے میں اس کم فہم نے بہت تحقیق کی کہ یہ کیا اصطلاح ہے 'کس زبان سے ہے' اوراس کے کیا معنی ہیں۔ اس حد تک تحقیق کر سکا ہوں کہ یہ اصطلاح زبان انگلیسی سے ہے۔ ایک لغت میں اس کے معنی ساجھے کی ہنڈیا لکھے نظر آئے اغلباً" اسی مفہوم میں یہ اصطلاح اس زمانے میں مستعمل تھی اور زبان زد خاص وعام تھی کہ اس کا چلن اس زمانے میں بہت تھا یعنی ساجھے کی ہنڈیا کا۔ مگر اس انداز سے کہ چوراہے پر نہیں پھوٹتی تھی اور ارباب فہم اس باب میں آنا کانی کو قرین مصلحت جانتے تھے۔ ہاں ایک دفعہ چوراہے میں پھوٹی تھی اس باعث کہ ہنڈیا بول پڑی۔ شرفا انگشت بدنداں رہ گئے کہ ہنڈیا بھی بولتی ہے۔ اس باب میں حیرت کے اسباب گوناگوں تھے۔ اول

اس سبب سے کہ یہ امر خلاف فطرت ہے - ہنڈیا پکتی ہے ' پھونتی ہے ' پر بولتی نہیں- دوم اس سبب سے کہ جس باب میں معلمین اخلاق بھی چپ رہنے کو ترجیح دیتے تھے اس باب میں ہنڈیا بول پڑی- سوم اس سبب سے کہ وہ زمانہ تنگی ترشی کا تھا- خلقت کے تن پہ کپڑا نہیں تھا ' پیٹ میں روٹی نہیں تھی- فاقوں نے توانائی سلب کر لی تھی - گھوڑوں میں ہنہنانے کی اور لوگوں میں آواز اٹھانے کی طاقت نہیں رہی تھی - ایسے میں ہنڈیا بول پڑی - سب حیران اور متوحش کہ اسے کیا کہا جائے- ایک خرد مند نے کہا کہ جو بولتا ہے وہ گواہی دیتا ہے - شرفا نے کہا کہ یہ تو ہنڈیا ہے جس کے پاس زبان نہیں ہے- خرد مند نے کہا کہ قرب قیامت کی نشانیوں میں ایک نشانی یہ ہے کہ مرغی بانگ دے گی اور ہنڈیا بولے گی - گواہی کی اس وقت یہی صورت ہو گی- زچ ہو کر علماء و شرفا یہ بولے کہ چونکہ وہ ہنڈیا ہے- اس لئے اس کی گواہی آدھی گواہی ہے-

اس زمانے کی تاریخ ایسے واقعات عجیب اور کوائف غریب سے بھری ہے کہ انہیں بیان کرتا چلا جاؤں تو دفتر لکھے جائیں یہ سوچ کر کہ رسالہ لمبا نہ ہو جاوے فقیر نے چیدہ چیدہ واقعات بیان کر دیئے ہیں اور نادرہ روزگار شخصیتوں کا سرسری تذکرہ کر دیا- عمر نے وفا کی تو یہ کوتاہ قلم اس داستان عبرت کی مزید تفاصیل قلمبند کر لے گا - فی الحال تھوڑے کو بہت سمجھا جاوے اور اس شعر پر اس تذکرے کو ختم تصور کیا جاوے سو

تازہ خواہی داشتن گر داغہائے سینہ را
گاہے گاہے بازخواں ایں قصہ پارینہ را

❋ = = = = = = = ❋
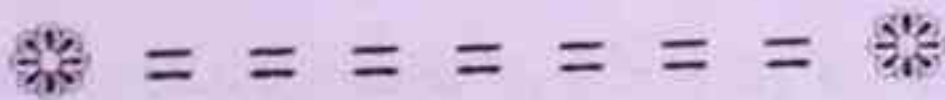
پچھلی کہانیاں

احسان منزل

یہ اس زمانہ کا ذکر ہے جب علامہ راشد الخیری ابھی زندہ تھے اور رسالہ عصمت" ہر مہینے باقاعدگی سے احسان منزل میں پہنچتا تھا۔ "عصمت" کی خریداری بھی دراصل احسان منزل کی تاریخ کا بہت اہم واقعہ ہے - یہ پرچہ جب پہلی مرتبہ احسان منزل میں پہنچا تو سارے محلہ میں ایک شور پڑ گیا۔ جس نے سنا اس نے دانتوں میں انگلیاں دابیں اور قرب قیامت کی پیشین گوئی کی اس روز مولوی مہربان علی اپنے بیٹے کے منی آرڈر کی امید میں ڈاک خانہ گئے ہوئے تھے۔ ڈاکیے اس وقت ڈاک چھانٹ رہے تھے۔ مولوی صاحب کیا دیکھتے ہیں کہ ایک پیکٹ پہ ماہنامہ "عصمت" دہلی چھپا ہوا ہے اور اس کے نیچے سرخ روشنائی سے شیخ عرفان الحق کی بیٹی کا پتہ لکھا ہوا ہے۔

مولوی مہربان علی کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں - وہ اپنا منی آرڈر تو بھول گئے اور ایک تازہ حادثے کے راوی بن کر محلہ کو لوٹے - انہوں نے محلہ کے چند سنجیدہ آدمیوں کو یہ واقعہ بڑی راز داری سے سنایا کہ عرفان الحق کے گھر رسالہ آیا ہے اور یہ کہ انہوں نے اس پہ اپنی آنکھوں سے ان کی بیٹی کا نام لکھا ہوا دیکھا ہے۔ لیکن ایسی خبر بھلا کب چھپتی ہے سارے میں یہ خبر بجلی کی طرح پھیل گئی کہ عرفان الحق کی کنواری بیٹی کے نام رسالے آتے ہیں - کنواری لڑکی کے نام رسالے آنا یہ خود کونسی کم معیوب بات تھی۔ اس پہ طرہ یہ کہ پتہ میں نام بھی اس کا لکھا ہوتا تھا - دلی سے یہاں تک کا ڈاک کا سفر کچھ ایسا مختصر نہ

تھا۔ نہ معلوم کتنے مردوں نے اور کیسے کیسے مردوں نے یہ نام پڑھا ہو گا اگر عرفان الحق ذرا عقلمند ہوتے تو پتہ میں بجائے "محترمہ محمودہ بانو معرفت شیخ عرفان الحق" کی عبارت کے سیدھا سادہ فقرہ "شیخ عرفان الحق" بھی ہو سکتا تھا۔ لیکن ان کی عقل تو کہیں چرنے چلی گئی تھی۔ جب اس افواہ نے زیادہ زور پکڑا اور اعتراضات ان تک پہنچنے شروع ہوئے تو انہوں نے بات پہ پردہ ڈالنے کی بجائے الٹی ہٹ دھرمی دکھائی۔ جس کسی معترض کا نام ان کے کان میں پڑا اسے انہوں نے جاہل اور دقیانوسی ٹھہرایا اور علی الاعلان یہ بات کہی کہ عورتوں کی تعلیم کا حکم کلام پاک میں آیا ہے۔ انہوں نے اپنے فعل کے جواز میں مختلف حدیثیں اور روایتوں کے حوالے سے یہ بھی ثابت کیا کہ حضرت فاطمہ زہرا عربی فارسی اور اردو میں دسترس رکھتی ہیں۔ واقعات سے قطع نظر عقلی دلیل ان کے پاس یہ تھی کہ مدینہ علم کی لخت جگر اور باب مدینہ علم کے گھر کی رانی جاہل کیسے ہو سکتی تھی۔ پتے میں محمودہ کے نام کا جواز بھی حضرت فاطمہ زہرا کے نام ہی کا مرہون منت تھا۔ وہ کہتے تھے کہ نبیؐ کی بیٹی سے زیادہ باعصمت اور پردہ دار اور کون عورت ہو سکتی ہے۔ اور ان کا نام آج تک ہزاروں نامحرموں کی زبان پر آتا ہے۔

عرفان الحق کی ساری دلیلیں برحق لیکن ان کا یہ اقدام تھا باغیانہ ہی۔ نہ ہوئے شیخ احسان الحق زندہ ورنہ یا تو وہ بیٹی کو کان پکڑ کے گھر سے نکال دیتے یا خود کپڑے پھاڑ کر گھر سے نکل جاتے۔ یوں زمانے کا طور انکی زندگی ہی میں بگڑ چکا تھا۔ اور سرسید کی تحریک زور پکڑتی جا رہی تھی۔ لیکن احسان منزل کی روایات پہ انہوں نے آنچ نہیں آنے دی۔ ان کے آگے دو جوان بیٹیاں بیٹھی تھیں لیکن مجال تھی کہ کوئی ایسا واقعہ ہو جاتا۔ پردے کا جو اہتمام سات پشتوں سے چلا آتا تھا وہ بدستور قائم تھا۔ شیخ صاحب پردے کی اس روایت پر شدت سے عامل تھے۔ جس کے زیر اثر کنواری بیٹیاں باپ، بھیّوں تک سے چھپتی تھیں۔ شیخ صاحب کو یہ تو پتہ تھا کہ ان کے دو بیٹیاں ہیں اور عرفان کو یہ معلوم تھا کہ گھر میں اس کی دو بہنیں رہتی ہیں۔ لیکن ان کی شکل وصورت کیسی ہے۔ یہ نہ تو باپ کو پتہ تھا اور نہ بھائی کو۔ بڑی لڑکی خدا بخشے بڑی بدنصیب تھی۔ اس کے نہ تو پھول کھلے اور نہ باپ اور

بھائی کی صورت دیکھنی اسے نصیب ہوئی - شیخ صاحب باہر بیٹھے بیٹھے حکیموں اور ڈاکٹروں کا انتظام کرتے رہے اور بیٹی اندر دم توڑتی رہی - اس جنتی بی بی کا سورج نے سر کھلا دیکھا ہو یا نہ دیکھا ہو اتنا طے ہے کہ مرتے دم تک کسی غیر مرد نے تو کجا باپ اور بھائی نے بھی اس کی صورت نہیں دیکھی- احسان منزل کے زنانے میں غیر مرد کا تو شاید ہی کبھی گذر ہوا ہو- ہاں بہشتی ضرور آتا تھا- وہ گھنٹوں دروازے پر شور مچاتا اور جب بڑی بوڑھیاں اور بچی بالیاں سب کمروں میں چلی جاتی تھیں تب وہ دبے پاؤں سر جھکائے اندر آتا گھڑے بھرتا اور نظریں نیچی کئے باہر چلا جاتا- غیر مرد اور ناول اور افسانے کی کتابیں دونوں کو احسان منزل میں ایک ہی حیثیت حاصل تھی- زبانی کہانیوں پر پابندی عائد کرنا تو خیر آدمی کے بس میں نہیں ہے- ویسے ناول اور افسانے کی کتاب کا احسان منزل کے زنان خانے میں کبھی گذر نہیں ہو پایا- رہا الف لیلہ کا معاملہ تو اس کے گذر کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا- ویسے وہ اس زمانے میں ہر گھر میں پر اسرار طور پر موجود رہتی تھی- اور کسی وقت بھی کسی بھی تکئے کے نیچے سے برآمد ہو سکتی تھی - البتہ ڈپٹی نذیر احمد کے ناول بے ضرر سمجھے گئے تھے اور زنانخانوں میں پہنچ گئے تھے- لیکن شیخ صاحب نے ان پہ بھی روک ٹوک کی-

لیکن قدرت بھی بڑی ستم ظریف ہے - بیٹے نے خاندان کی ساری روایات کو خاک میں ملا دیا- بیٹا حضرت نوح کا بھی بہت بدنام ہے- لیکن عرفان نے تو کوئی تسمہ ہی نہیں لگا کے رکھا- ہر بات میں باپ کی ضد کی- اس نے تو باپ کی زندگی ہی میں ہاتھ پیر نکالنے شروع کر دیئے تھے - اس نے علی گڑھ کالج میں پڑھنے کے لئے بہت ضد کی لیکن شیخ صاحب نے صاف انکار کر دیا اور کہا کہ بڑھاپے میں مجھے اپنی عاقبت بگاڑنی منظور نہیں ہے- مجھے خدا کو منہ دکھانا ہے وہاں کیا جواب دوں گا - لیکن عرفان کے سر پر تو بھوت سوار تھا- اس نے ایک روز یہاں تک کہہ ڈالا کہ اصل چیز نیچر ہے - اڑتے اڑتے یہ خبر شیخ صاحب تک پہنچی- انہوں ے سارا گھر سر پر اٹھا لیا- انہیں تو یقین ہو چلا تھا کہ ان کا بیٹا نیچریہ ہو گیا ہے اور اس بنا پہ وہ اسے عاق کرنے پر بھی آمادہ ہو گئے تھے- لیکن خاندان کے بڑے بوڑھوں کے بیچ میں پڑ جانے کی وجہ سے معاملہ رفع دفع ہو گیا- خاندان کے ہر بزرگ نے

عرفان کو سمجھایا کہ بیٹا خاندان کی عزت کا خیال نہیں ہے تو کچھ اپنی عاقبت کا ہی خیال کرو۔ عرفان اس وقت تو چپکا ہو گیا۔ لیکن دماغ کا کیڑا نہیں نکلا۔ ایک دفعہ وہ بائیس رجب کے موقعہ پر نیاز پر بھی اعتراض کر بیٹھا۔ اس کے بعد اسے وہابی کا خطاب ملا۔

عرفان کو انگریزی پڑھنی نصیب نہ ہوئی۔ اس لئے وہ نیچری نہ بن سکا۔ لیکن شیخ صاحب کے مرنے کے بعد ہی نذر نیاز اور رسم ورواج پہ اس نے اس شدت سے اعتراض کئے کہ لوگوں کو یہ یقین ہو ہی گیا کہ وہ وہابی ہو گیا ہے۔ شیخ صاحب کے مرتے ہی اسے بزرگی کا شرف حاصل ہو گیا تھا۔ اور عرفان سے یکایک وہ شیخ عرفان الحق بن گیا تھا۔ لیکن جس شخص کے لچھن یہ ہوں اس کی بزرگی کب تک قائم رہ سکتی تھی۔ چنانچہ تھوڑے ہی دن میں شیخ عرفان الحق، شیخ عرفان الحق کہلانے کی بجائے شیخ عرفان وہابی کہلانے لگے۔ شیخ عرفان وہابی کا راج کیا آیا احسان منزل کی روایات ہی منقلب ہو گئیں۔ پہلے بہشتی کا طور یہ تھا کہ دروازہ کھٹکھٹاتا تھا۔ اور جب سب عورتیں اندر کمروں میں چلی جاتی تھیں تو وہ اندر داخل ہوتا تھا۔ اب وہ منہ پہ تولیہ ڈال بے دھڑک زنانخانے میں چلا آتا تھا۔ چھوٹی شیخانی دروازے کے اوٹ کھڑے ہو کر خانساماں سے بے محابا باتیں کرتی تھیں اور اکثر ان کی باتوں کی آواز مردانے میں پہنچ جایا کرتی تھی۔ شیخانی جی کے زمانے میں یہ عالم تھا کہ ۲۲ رجب کی نیاز پر ایندھن کی لکڑیوں کو گھنٹوں توڑے دیتیں، تین مرتبہ پاک کرتیں اور پھر ان پہ پوریاں پکاتی تھیں۔ لیکن اب ایندھن تو کجا چمٹا پھونکنی تک کو پاک نہیں کیا جاتا تھا اور پوریاں کمرے سے صحن تک میں آجاتی تھیں۔ خواہ بیچ میں موری ہی کیوں نہ پڑے۔ محمودہ پندرہ سولہ کے سن میں تھی لیکن باپ کے سامنے بے محابا آتی تھی۔ اور اب عصمت کا پرچہ بھی اس کے نام جاری ہو گیا تھا۔ تھوڑے دن بعد لاہور کا ایک پرچہ تہذیب نسواں بھی اس کے نام آنے لگا۔ اور پھر راشد الخیری کے ناول کی وی پیاں اس کے نام موصول ہونے لگیں۔

ان تمام باتوں کے باوجود احسان منزل میں انقلاب اتنا زبردست نہیں آیا تھا جتنا لوگوں نے سمجھا تھا۔ بیچارے شیخ عرفان وہابی کچھ ضرورت سے زیادہ ہی بدنام ہو گئے تھے۔ محمودہ

تعلیم ضرور حاصل کر رہی تھی لیکن اسے آزادی کا پروانہ نہیں ملا تھا۔ چھوٹی شیخانی اتنی نا عاقبت اندیش نہ تھیں کہ جوان بیٹی کو کھلی چھٹی دے دیتیں۔ اگر کبھی اس کا سر بھی ذرا کھل گیا تو چھوٹی شیخانی نے اس پر روک ٹوک کی۔ ہر جوان لڑکی کا کسی نہ کسی موقعہ پر الھڑ چال چلنے کو ضرور جی چاہتا ہے۔ لیکن چھوٹی شیخانی تو محمودہ کو فوراً ٹوک دیتی تھیں "بی بی یہ کیا طور نکالا ہے چلنے کا۔ سیانی لڑکیاں ایسے نہیں چلا کرتیں کمر جھکا کر چلا کرو"۔ زور سے ہنسنے تک پہ انہیں اعتراض تھا ہنسی اپنے عروج پر پہنچنے نہیں پاتی تھی کہ وہ بول اٹھتی تھیں۔ "محمودہ یہ کیا ٹھیکرے پھوٹ رہے ہیں۔ بیاہ تو ہو جانے دو خوب ہنسنا مگر کنوارپت میں ہمیں یہ باتیں اچھی نہیں لگتی ہیں"۔ محمودہ نے جب کبھی ذرا زیادہ بننے سنورنے کی کوشش کی۔ چھوٹی شیخانی نے اسے یہی تہدید آمیز بشارت دی کہ "بیٹی ماں کے گھر یہ چٹک مٹک اچھی نہیں لگتی۔ دولہا مل جائے پھر تمہیں آزادی ہی آزادی ہے"۔ محمودہ نے جب اپنی قمیض کا گریبان گردن سے ذرا نیچا کاٹ لیا تھا تو بھی انہیں یہی اعتراض ہوا تھا۔ محمودہ جب نہا دھو کر یہ قمیض پہن کر نکلی تو چھوٹی شیخانی کا اسے دیکھتے ہی پارہ چڑھ گیا۔ کہنے لگیں "بیٹی کنوارپت میں یہ بیحیائی۔ ماں کا گھر اچھا نہیں لگتا کیا؟ میں تمہیں باندھ کے تو نہیں رکھوں گی۔ تھوڑے دن کی بات ہے۔ اپنے گھر چلی جاؤ تو پھر جو مزاج میں آئے کرنا"۔

اس قسم کے تمام موقعوں پر شیخ عرفان وہابی یا تو غیر جانبدار رہے۔ یا چھوٹی شیخانی کا ساتھ دیا۔ وہ تعلیم کے قائل تھے آزادی کے قائل نہیں تھے۔ اگر انہوں نے بیٹی کو انگریزی نہیں پڑھائی تھی تو اس کی وجہ یہی خیال تھا کہ لڑکیاں انگریزی پڑھ کر آزاد ہو جاتی ہیں۔ وہ روشن خیالی کی انتہا اسی کو سمجھتے تھے کہ لڑکی کو اتنا پڑھا لکھا دیں کہ وہ اصلاحی اور تربیتی کتابیں اور رسالے پڑھ سکے اور محمودہ اتنا پڑھ لکھ گئی تھی۔ عصمت بک ڈپو سے جو کتاب بھی شایع ہوتی۔ محمودہ نے اسے منگانے کا اشتیاق ضرور ظاہر کیا۔ شیخ عرفان وہابی کو اس شوق کو پورا کرنے میں اعتراض کبھی نہیں ہوا۔ لیکن اتنا اہتمام انہوں نے ضرور کیا کہ راشد الخیری کے ناول کم اور تربیتی کتابیں زیادہ منگائی جائیں۔ راشد الخیری کے ناول بے ضرر سہی لیکن پھر ناول تھے۔ نہ معلوم کس ناول میں کیا لکھا ہوا نکل آئے۔ البتہ تربیتی

کتابیں منگانے پر وہ خود محمودہ کو مائل کرتے تھے۔ چنانچہ جب "عصمتی دسترخوان" کے لئے اس نے روپے مانگے تو انہوں نے مطلق چوں چرا نہیں کی اور پہلی کو تنخواہ ملتے ہی اس کا مطالبہ پورا کر دیا۔

"عصمتی دسترخوان" کی وی۔ پی کے انتظار میں محمودہ نے کئی دن بڑی بے چینی سے کاٹے۔ ڈاک کے وقت بے چینی میں اور اضافہ ہو جاتا تھا۔ لیکن کمبخت ڈاکیہ آتا اور کوئی خط ڈال کر واپس چلا جاتا۔ وی۔ پی کی کتابیں محمودہ کے نام پر ہی آتی تھیں۔ اس لئے وی پی براہ راست محمودہ کے پاس لائی جاتی اور وہ رسید کی چٹ پہ دستخط کر کے کتاب کھولتی شیخ عرفان وہابی کو وی پی وصول کرنے یا انہیں کھولنے سے کبھی دلچسپی نہیں ہوئی بلکہ الٹی الجھن ہوتی تھی۔ لیکن اس مرتبہ جانے انہیں کیا سوجھی کہ بیٹھک میں جب ڈاکیہ آیا تو انہوں نے خطوط کے ساتھ ساتھ وی پی بھی وصول کر لی۔ انہیں یہ دیکھ کر کچھ تعجب سا ہوا کہ بنڈل پہ عصمت بک ڈپو کا نہیں بلکہ کسی دوسرے ناشر کا پتہ درج تھا۔ انہوں نے بنڈل جو کھولا تو کیا دیکھتے ہیں کہ "عصمتی دسترخوان" کی بجائے پریم چند کا ناول "بازار حسن" رکھا ہے۔ شیخ عرفان وہابی سناٹے میں آگئے۔

شیخ عرفان وہابی نے بیٹی سے تو کچھ نہیں کہا لیکن اس دن رات کو شیخ اور شیخانی میں سرگوشیوں میں بہت سی باتیں ہوئیں۔ محمودہ نے بہت کان لگائے مگر وہ صرف ایک ہی فقرہ سن سکی۔ شیخانی کہہ رہی تھی "اجی یہ لونڈیا ہمارا منہ کالا کرائے گی۔ جیسا بھی لونڈا ملے بس اس کے چار بول پڑھا ہی ڈالو"۔

یہ بھی ایک ستم ظریفی ہے کہ انسان سے زیادہ انسان کی بنائی ہوئی چیزوں کی عمر ہوتی ہے۔ آدمی میں ہزار عیب سہی لیکن ایک تو وہ اوچھا نہیں ہے۔ دوسرے اسے اپنی ذات پہ اعتماد ہے۔ اس لئے وہ ایسی چیزیں بناتا ہے جو اس سے زیادہ عمر پاتی ہیں' احسان منزل' شیخ احسان الحق' نے بنوائی تھی۔ قبر میں ان کی ہڈیوں کی خاک تک اب سلامت نہ ہو گی لیکن "احسان منزل" ابھی تک صحیح و سالم کھڑی تھی۔ احسان منزل سے زیادہ پرانی "احسان منزل" کی روایات تھیں۔ یہ تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ ان روایات کی بنیاد کس نے ڈالی

تھی اور کس کس کی ذہنی اپج اور نفسیاتی پیچ نے اس کی بنیادوں کو پختہ کیا تھا۔ شیخ احسان الحق کا تو اتنا کارنامہ تھا کہ انہوں نے ان کی حفاظت کے لئے "احسان منزل" بنوا دی۔ احسان منزل نے کئی دور اپنی آنکھوں سے بنتے بگڑتے دیکھے اور سلامت کھڑی رہی۔ سید احمد نیچری سید احمد نیچری سے سر سید احمد علیہ الرحمتہ بنے۔ ڈپٹی نذیر احمد کا فرومرتد بننے کے بعد مصلح قوم ٹھہرے ۔ دیکھتے دیکھتے ان کے ناولوں پہ ایک اور عمارت کھڑی ہوئی اور راشد الخیری کے ناول ہر گھر میں دیکھے جانے لگے۔ پھر اچانک پریم چند کے افسانوں اور ناولوں نے زور باندھا۔

"احسان منزل" کے بزرگ "احسان منزل" سے ہجرت کر کے قبرستان میں چلے گئے تھے۔ اور کل کے بچوں نے بزرگوں کی حیثیت اختیار کر لی تھی۔ اب ان کی جگہ بچوں کی ایک نئی کھیپ کمروں اور صحن میں امنڈتی نظر آتی تھی۔ شیخ عرفان وہابی اور چھوٹی شیخانی کی آنکھ بند ہوتے ہی محمودہ نے، محمودہ بو کی اور سجاد دولہا نے شیخ سجاد کی حیثیت اختیار کر لی عجلت میں جو بھی شادی ہوتی ہے اس میں کچھ کھپلا ضرور رہ جاتا ہے ۔ سجاد دولھا یوں انٹرنس پاس تھے لیکن تھے نکھٹو اور شادی کے بعد بھی نکھٹو رہے۔ اس لئے محمودہ کو پرائے گھر جانے کی زحمت اٹھانی نہیں پڑی۔ احسان منزل میں ہی اس کا گھر بس گیا۔ نکھٹو پن ہے تو عیب ہی مگر نکھٹو ہوتے ہیں قسمت کے دھنی ۔ بزرگوں کی موجودگی میں ان کی حیثیت کچھ بھی ہو مگر ان کے مرتے ہی وہ خاندان کے بدھ بن جاتے ہیں ۔ بعض نکھٹو دونوں جنم میں مزے اڑاتے ہیں۔ جوانی میں چھوٹے میاں کہلاتے ہیں۔ بڑھاپے میں بڑے ابا بن جاتے ہیں۔ سجاد جوانی میں چھوٹے میاں اس لئے نہ کہلایا کہ اس نے احسان منزل سے باہر ایک ایسے گھر میں ہوش سنبھالا تھا جس کی مالی حیثیت کچھ ایسی ہی تھی بڑھاپے میں بڑے ابا کا مرتبہ اس لئے حاصل نہ ہوا کہ گنتی کے دو بچے تھے، ایک لڑکا ایک لڑکی ۔ ان کی بات قبول عام کا شرف کیا حاصل کرتی ۔ تو بات صرف اتنی رہی کہ سجاد حسین اپنے گھر سیدھے سادے سجاد رہے، احسان منزل میں آکر سجاد دولھا بن گئے اور شیخ عرفان وہابی کے مرنے پر شیخ سجاد کی حیثیت اختیار کر لی۔

بعض خواہشیں نسلوں بعد جاکر پوری ہوتی ہیں۔ یہ خواہش شیخ عرفان وہابی کی تھی کہ علی گڑھ میں جاکر تعلیم حاصل کریں وہ علی گڑھ کالج میں تعلیم حاصل نہ کر سکے لیکن ان کا نواسہ بہت دھوم سے علی گڑھ بھیجا گیا شیخ سجاد نے اسے علی گڑھ بھیجتے وقت گھر میں یہ اعلان کیا تھا کہ "ہم اعجاز کو بی اے تک پڑھائیں گے"۔ اس پہ محمودہ بو نے بڑے چاؤ سے کہا کہ "خدا نظرِبد سے بچائے اللہ نے چاہا تو میرا اعجاز خاندان میں پہلا بی اے ہو گا"۔

اعجاز کی قسمت پہ حمیدہ کو رشک ضرور ہوا تھا۔ لیکن ظاہر ہے کہ اسے علی گڑھ نہیں بھیجا جا سکتا تھا۔ اول تو یہ کہ علی گڑھ میں ایسا کونسا اپنا بیٹھا تھا۔ جس کے گھر حمیدہ کو چھوڑا جاتا۔ پھر یوں بھی محمودہ بو اور شیخ سجاد لڑکیوں کو کالج میں تعلیم دلانے کے سخت خلاف تھے ۔ ان کا خیال تھا کہ اصل چیز تو تعلیم ہے اور وہ گھر پہ بھی حاصل کی جا سکتی ہے۔ انہوں نے اس خیال کا اظہار ہی نہیں کیا بلکہ اسے عملی جامہ بھی پہنایا ۔ چنانچہ انگریزی کا ماسٹر رکھا گیا جو دونوں وقت احسان منزل میں آتا اور پردے کے پیچھے سے حمیدہ کو انگریزی پڑھاتا۔ کہنے والوں نے سب کچھ کہا۔ ساری برادری میں یہ خبر آگ کی طرح پھیل گئی کہ محمودہ کی بیٹی انگریزی پڑھ رہی ہے۔ دنیا میں ہر طرح کی طبیعتیں ہوتی ہیں بعض شریف طبع نیک طبیعت عورتوں کو اس کا یقین نہیں آیا۔ سلیمن نانی نے اسے محمودہ بو پہ تہمت قرار دیا۔ لیکن ان کا ایمان کب تک سلامت رہتا۔ اجو نے قسمیں کھا کر کہا کہ اس نے اپنی آنکھ سے "احسان منزل" میں انگریزی کی کتاب دیکھی ہے۔ پھر اسی نے یہ روایت بھی سنائی کہ حمیدہ کو ایک ماسٹر پڑھانے آتا ہے۔ یہ خبر جس نے بھی سنی اس نے کانوں پہ ہاتھ رکھے۔ سلیمن نانی کو اس واقعہ سے بہت عبرت ہوئی۔ انہیں بے ساختہ محمودہ بو کی پھوپھی یاد آگئیں ۔ کہنے لگیں "بی بی یہ آج کی سی بات ہے۔ اسی محمودہ بو کی پھوپھی مرتے مر گئیں۔ باپ بھیّوں کی صورت نہیں دیکھی اور آج اسی گھر میں ماسٹر پڑھانے آتے ہیں ۔ توبہ توبہ کیا زمانہ آیا ہے"۔ اجو کا خیال تھا کہ اس واقعہ سے شیخ عرفان وہابی کی روح کو سخت تکلیف پہنچی ہوگی۔

صرف اس ایک واقعہ پر منحصر نہیں ہے۔ لوگوں کو احسان منزل کے اور بہت سے

بدلتے ہوئے طریقوں پر اعتراض تھے۔ شیخ عرفان وہابی کے زمانے میں بائیس کی نیاز کی پوریاں صرف صحن میں آسکتی تھیں۔ اب وہ بیٹھک میں بھی پہنچتی تھیں اور چائے کے ساتھ ناشتہ کا کام دیتی تھیں۔ صرف اتنا ہی نہیں بلکہ مٹی کے کونڈے بھی غائب ہوتے جا رہے تھے اور ان کی جگہ چینی کے پلیٹ لے رہے تھے۔ ایک سال محمودہ بونے یہ ستم کیا کہ ایک کونڈا میٹھی پوریوں کی بجائے بالو شاہیوں کا کیا۔ محمود بو عمر کے عذر پر اب پردے سے بھی بے نیاز ہوتی جا رہی تھیں۔ خانساماں سے پردہ تو خیر اٹھ ہی گیا تھا۔ کبھی کبھی سقے کی آمد کے موقعہ پر بھی یہ ہوتا کہ حمیدہ تو اندر چلی جاتی اور وہ کہتیں "میرے بال سفید ہونے کو آئے اب میرا کاہے کا پردہ ہے - بھیا آنکھیں نیچی کر کے آجا"۔ حمیدہ کے لباس اور طور طریقوں میں بھی ایسی تبدیلی آئی تھی جو آج سے پہلے احسان منزل کی کسی کنواری لڑکی میں نہیں دیکھی گئی تھی۔ حمیدہ نے گریبان کے نئے نئے کاٹ سیکھ لئے تھے محمودہ بونے کنوارپت میں کبھی ڈھیلا پائجامہ نہیں پہنا لیکن حمیدہ تنگ موری کا پائجامہ پہننا اپنی کسر شان سمجھتی تھی۔

محمودہ بونے لوگوں کی باتوں پہ بالکل دھیان نہیں دیا ہاں بیٹی پہ کڑی نگاہ رکھی۔ وہ تعلیم اور آزادی دونوں کی حامی تھیں لیکن بے شرمی کی حامی نہیں تھیں۔ نیچے گریبان پہ وہ کبھی معترض نہیں ہوئیں لیکن دوپٹہ جب کبھی سینے سے ڈھلکا محمودہ بونے سختی سے تنبیہہ کی - جب ماسٹر پڑھانے آتا تھا تو پردہ کے پیچھے وہ بھی بیٹی کے برابر جاکر بیٹھتی تھیں۔ جب وہ کسی کام میں مصروف ہوتیں تو پھر فوراً گھر کے سارے کام کو چھٹی دے کر اس فرض کو انجام دیتی ' محمودہ بونے یہ بھی صاف کہہ دیا تھا کہ "ہم لونڈیا کو کوئی امتحان نہیں دلائیں گے" ان کا استدلال یہ تھا کہ "ہمیں اپنی بیٹی کو ایف اے بی اے کرا کے کوئی نوکری تھوڑا ہی کرانی ہے"۔ محمودہ بو خود پڑھی لکھی تھیں اس لئے اس پہ بھی نظر رکھتی تھیں کہ بیٹی کس قسم کی کتابیں پڑھتی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ اس معاملہ میں کچھ زیادہ روک ٹوک نہیں کرتی تھیں۔ اس وجہ سے ان کی تھوڑی سی بدنامی بھی ہو گئی تھی - یہ بات محلہ بھر میں مشہور تھی کہ محمودہ بو کی لونڈیا ناول پڑھتی ہے اور یہ محض افواہ نہیں تھی۔ حمیدہ

نے راشد الخیری ہی کے نہیں بلکہ پریم چند کے بھی ناول پڑھ رکھے تھے۔ پھر عظیم بیگ چغتائی کی کتابیں پڑھنے کا بھی اسے چسکا پڑ گیا تھا۔ البتہ فحش کتابوں کا احسان منزل میں کبھی گذر نہیں ہو پایا۔ محمودہ بو یوں محتاط پہلے بھی تھیں لیکن جب ننھی چچی علی گڑھ ہو کر آئیں اور انہوں نے وہاں والوں کی بداطواریوں کا ذکر کیا تو وہ اور بھی چوکنی ہو گئیں۔

ننھی چچی کا بیٹا شرافت، علی گڑھ میں تالوں کا کام سیکھتے سیکھتے اب اچھا خاصا مستری بن گیا تھا۔ ننھی چچی اس کے پاس دو مہینے رہ کر آئیں اور اس کی آمدنی کی طرف سے مطمئن ہو کر واپس آئیں۔ انہوں نے لڑکے لڑکیوں کا جو واقعہ بھی سنایا وہ حیرتناک اور عبرتناک ثابت ہوا۔ لیکن جس واقعہ کو سنکر واقعی سب عش عش کرنے لگے وہ یہ تھا کہ کالج کی ایک لڑکی نے بے شرمی کے قصے لکھنے شروع کر دیئے ہیں۔ سلیمن نانی کی شرافت طبع پھر ان کے آڑے آئی۔ انہوں نے اس واقعہ پہ یقین کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ ننھی چچی نے ان کے سر کی بھی قسم کھائی۔ لیکن انہوں نے پھر یہی کہا "نا بی بی میں نہ مانوں گی۔ ایسا ہوا تو قیامت نہ آجاوے گی"۔

ننھی چچی کو اس پہ اک ذرا غصہ آگیا۔ "اے لو مجھے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت پڑی تھی۔ سارے علی گڑھ میں تو اس کا نام روشن ہو رہا ہے اور ایسے ویسے گھرانے کی بھی نہیں ہے۔ سنتی ہوں کہ شریف گھرانے کی لونڈیا ہے۔ کوئی اختائی چغتائی والے ہیں۔ ان کی بیٹی ہے"۔

سلیمن نانی نے بیساختہ تاؤ میں آکر کہا۔ "خاک پڑے ایسے شریف خاندان پہ جس میں ایسی باتیں ہوویں"۔

دراصل اس کا سب سے زیادہ اثر محمودہ بو پہ ہوا۔ یوں انہوں نے اس کا بالکل اظہار نہیں ہونے دیا۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ انہیں رہ رہ کر اعجاز کا خیال آرہا تھا۔

اس ذکر نے محمودہ بو کو اچھا خاصا خوفزدہ کر دیا تھا۔ ان کے دل میں ہولیں اٹھنے لگیں کہ کہیں کوئی لڑکی ان کے اعجاز کو اپنے پھندے میں نہ پھنسا لے۔ ان کا بس چلتا تو وہ فورا تار بھیج کر اعجاز کو علی گڑھ سے واپس بلا لیتیں۔ انہوں نے اپنے وسوسوں کا اظہار شیخ سجاد

سے خاصی شدت سے کیا تھا۔ لیکن انہوں نے ہنس کے ٹال دیا۔ ان کی لاپرواہی رنگ لائی۔ محمودہ بو کو جس بات کا ڈر تھا وہ ہو کے رہی۔ شرافت علی گڑھ سے جب آیا تو بیٹا مدتوں بعد آیا تھا مگر ننھی چچی کو ہوش کہاں تھا۔ انہیں ایک نیا دکھڑا لگ گیا۔ چادر اوڑھ لپک جھپک احسان منزل پہنچیں - چارپائی پہ بیٹھتے ہی یہ نکلیں۔" اجی محمودہ بو یہ تمہارے لونڈے نے کیا کیا ہے میرا شرافت آیا ہے - کہوے ہے کہ سارے علی گڑھ میں تھڑی تھڑی ہو رہی ہے -" محمودہ بو کی جان سن سے نکل گئی - یہ خبر فوراً مردانے میں پہنچائی گئی اور شیخ سجاد نے فوراً شرافت کو بلا بھیجا۔ شرافت کے پاس اس روایت کے سہارے کے لئے کچھ زیادہ شواہد موجود نہیں تھے - لیکن روایت خود اتنی مضبوط تھی کہ شیخ اعجاز اور محمودہ بو کو اسے قبول کر لینے کے سوا اور کوئی چارہ نظر نہ آیا۔ محمودہ بو خود تو بری ہو گئیں۔ کچھ الزام انہوں نے قسمت کو دیا اور کچھ شیخ سجاد کو جنہوں نے اسے علی گڑھ پڑھنے بھیجا تھا۔ ان کے ذہن سے یہ بات اتر گئی کہ اس مہم میں شیخ سجاد کو ان کی پوری حمایت و تائید حاصل تھی۔

اعجاز کو فوراً تار کھڑکایا گیا اور جب تیسرے دن اعجاز گھر آیا۔ تو شیخ سجاد اور محمودہ بو دونوں کے دل میں شرافت کی روایت کی طرف سے جو تھوڑا بہت شبہہ تھا وہ اس کے حلیہ کو دیکھ کر زائل ہو گیا - چوڑے پائنچوں کا گاڑھے کا پائجامہ ' گاڑھے کا سفید بنگالی کرتا ' سر پہ بالوں کا جھنڈ کا جھنڈ - چہرے پہ عینک ' دہریوں کے سر پہ سینگ تو ہوتے نہیں بس انہیں علامتوں سے پہچانے جاتے ہیں - خیر یہیں تک بات رہتی لیکن اعجاز نے دلیری یہ کی کہ شیخ سجاد کے منہ پر یہ بات کہی کہ فلسفہ سے خدا کا وجود ثابت نہیں ہوتا - شیخ سجاد بہت دونکے دھاڑے اور محمودہ بو خوب روئیں دھوئیں لیکن اعجاز عقیدے کا پکا تھا ' ٹس سے مس نہ ہوا۔

محمودہ بو کی رائے یہ تھی کہ اعجاز کو علی گڑھ واپس بھیجا ہی نہ جائے لیکن شیخ سجاد آخر مرد تھے۔ انہوں نے سمجھداری سے کام لیا - اعجاز کا انٹرمیجیٹ کا دوسرا سال تھا اور امتحان سر پہ کھڑا تھا۔ انہوں نے کہا کہ "خیر یہ امتحان دے لو - لیکن اب آگے ہم نہیں پڑھائیں

گے۔

سامان سفر سے چیزیں گم ہوتی اکثر دیکھی گئی ہیں اور اعجاز کا سامان یوں بھی عجلت میں بندھا تھا۔ تنت وقت پہ اسے پتہ چلا کہ اس کی کتابوں میں سے ایک کتاب گم ہے۔ سارا گھر ڈھونڈا گیا۔ نورن نے ایک ایک کونہ چھان مارا لیکن کتاب نہ ملی اور اعجاز اپنی ایک کتاب کھوکر علی گڑھ روانہ ہوا۔ ماں پھر ماں ہوتی ہے۔ محمودہ کو ہر چند یہ پتہ تھا کہ ان کتابوں نے ہی اعجاز کے دماغ میں فتور پیدا کیا ہے پھر بھی انہیں بیٹے کے جانے کے بعد کئی دن تک اس کی کتاب کی فکر رہی اور انہوں نے اس سلسلہ میں حمیدہ سے لے کر نورن تک سب کو تلتکایا کہ "گھر ہے بزار تو نہیں ہے۔ کتاب جائے گی کہاں یہیں ہو گی ڈھونڈو"۔ یہ سہرا نورن کے سر بندھنا تھا۔ صبح کو بستر طے کرتے کرتے وہ ایک کتاب لے کر محمودہ بو کے پاس پہنچی" بوجی! ذرا دیکھو تو سہی۔ یہ کتاب تو نہیں ہے۔ اعجاز میاں کی"۔

محمودہ بو نے کتاب دیکھی تو دم بخود رہ گئیں' کچھ غصہ اور کچھ گھبراہٹ اور حیرت سے بولیں۔" علی گڑھ والی کی کتاب؟ اری کہاں سے آئی"۔

نورن بولی" بوجی میں حمیدہ بی بی کا بستر جھاڑ رہی تھی۔ ان کے گدے کے نیچے تھی یہ کتاب"۔

محمودہ بو نے اس بات کو پھیلانا مناسب نہ سمجھا۔ نورن سے وہ کتاب لے لی اور چپکی ہو گئیں۔ البتہ رات کو جب تخلیہ ہوا تو انہوں نے شیخ سجاد کو یہ واقعہ سنایا اور کہا کہ "جوان لونڈیا کا گھر میں بٹھانا اچھا نہیں ہے۔ اچھا برا جیسا لونڈا ملے اسے ٹھکانے لگا دو۔ اور میں پھر کہتی ہوں کہ امتحان جائے بھاڑ میں اعجاز کو واپس بلا لو"۔

۱۹۵۲ء

❁ = = = = = = = = ❁
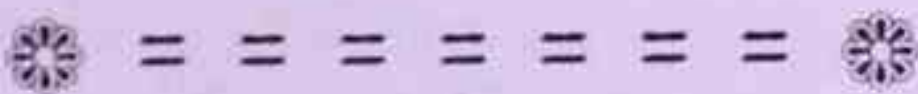
مجیدا

یوں مجیدا جج صاحب کے نام سے گھستا تھا۔ مگر جب انکا آدمی اسے بار بار بلانے آیا تو کم بخت مروت کی آنکھ۔ اسے منع نہ کر سکا۔ مجیدا میں یہی تو لاکھ روپے کی بات تھی کسی کام میں عذر ہی نہ تھا۔ کوئی بھی کسی کام کو کہے۔ جھٹ اٹھ کھڑا ہوتا۔ پرار کے سال جب سقوں نے ہڑتال کی تھی تو اس نے گھڑے بھر بھر گھر گھر پانی پہنچایا تھا اور یہ حال کیا کہ سقے ہفتے بھر کے اندر اندر پانی مانگ گئے ۔ پیپل والے کنوئیں پر اس نے دن دن بھر پانی بھرا ہے ۔ محلے والوں نے بھی کمال کیا۔ بچوں اور بوڑھوں کی بات تو جانے دیجئے ۔ بے کٹے موٹے مسٹنڈے گھڑے اور بالٹیاں اور لوٹے لے کر آتے اور اطمینان سے کنوئیں کی من پہ رکھ دیتے مجیدا نے بھی چشمہ فیض جاری کر رکھا تھا۔ کنویں پہ جو برتن آیا وہ بھرا ہوا ہی گیا۔ سیدانی جی کے کوئی مرد نہ تھا سو انکے گھر وہ خود ہی پانی پہنچا کے آیا۔ حق یہ ہے کہ سیدانی جی نے اپنا سارا رنڈاپا محلے کے بچوں اور مجیدا کے زور پہ کاٹا تھا۔ مجیدا محلّہ بھر کا سودا سلف لایا کرتا تھا۔ سیدانی جی کو کیا وہ منع کردیتا۔ منڈی میں جس کسی نے آموں کا ٹوکرا چکایا اور اسے مزدور نہ ملا اسے بالآخر مجید ہی کی مدد لینی پڑی۔ گڑ کے بھیلوں اور شکر قندیاں خریدنے والوں کی بھی اکثر اس نے مشکل حل کی تھی ۔ اور بڑے کے گوشت کے معاملے میں تو سب تھے ہی اس کے محتاج ۔ اول تو اسے گوشت کی پہچان ہی بہت تھی ۔ پھر ہر قصائی سے اس کی تو تکار تھی جس کسی کے اچھا جانور ہوا اسی کے پہنچ گیا۔ اور اچھے سے

اچھے حصے کو بنوا کے لے آیا۔ اوپر سے چربی اور گردے مستزاد لیکن کبھی کبھی یہ سانحہ بھی گزرتا تھا کہ کوئی بی بی اچھے خاصے گوشت میں کیڑے ڈالتی اور واپس کر دیتی اس معاملے میں چھوٹی سیٹھانی بہت بدنام تھیں ۔ چیزوں میں خرابی نکالنا ان کی عادت میں داخل تھا۔ مجیدا غریب کس گنتی میں تھا، وہ تو اسومیا کی لائی ہوئی چیزوں پر ناک مارتی تھیں۔ اس بات پر میاں بیوی میں نہ جانے کتنی مرتبہ ٹھنی ہو گی۔ مگر چھوٹی سیٹھانی کی رسی کے بل جوں کے توں رہے ۔ مجیدا کے لائے ہوئے سودے میں تو وہ ادبدا کرنی نکالتی تھیں۔ سینے کا گوشت ہے، سنہری بوٹی چربی کی تہیں کی تہیں چڑھی ہوئی، ایک سے ایک اچھی ہڈی اور چھوٹی سیٹھانی ہیں کہ بگڑ رہی ہیں۔" ارے مجیدا یہ کتوں کے کھانے کا گوشت کہاں سے اٹھا لایا ہے۔ نہ بابا ہم نہیں لیں گے یہ چھیچھڑے ۔" مجیدا چیزوں کو ٹھکانے لگانا بھی خوب جانتا تھا یہی گوشت وہ سیدانی جی کو دے آتا اور الٹا احسان دھرتا کہ سیدانی جی خاص تمہارے لئے سینے کا بنوا کے لایا ہوں سیدانی جی ایک ایک بوٹی کی تعریف کرتیں ۔ اور اسے لاکھوں دعائیں دیتیں۔ اور مجیدا اپنے لائے ہوئے گوشت کی تعریف سن کر یوں پھول جاتا جیسے شاعر اپنے شعروں کی تعریف سن کر پھول کے کپا ہو جاتے ہیں۔

سچ پوچھئے تو سارا محلہ مجیدا کے احسانوں میں دبا پڑا تھا۔ روز مرہ کا سودا سلف ہو یا کبھی کبھار کی شادی غمی ہو وہ بہر صورت ہر کام میں ہاتھ بٹاتا تھا۔ جب سیدانی جی کے لونڈے کے ختنے ہوئے تھے تو نائی سے لے کر نیم کی ٹہنیوں تک کا انتظام اسی نے کیا تھا۔ حاجی گلز باغ علی کی بیٹی کے بیاہ میں براتیوں کے لئے چارپائیاں بھی جمع کر کے وہی لایا کھانے کے وقت پانی بھی اسی نے پلایا۔ بہو کے ڈولے پر بکھیر کے وقت اکنیوں دونیوں کی تھیلی بھی اسی نے تھامی۔ اور اسومیاں کے گھر تو شاید ہی کوئی کار ہوا ہو جس میں مجیدا شریک نہ ہوا ہو۔ جب خود !اسومیاں کی شادی ہوئی تھی تو اس نے کھڑے ہو کر اپنے سامنے بریانی اور قورمے کی دیگیں اتروائیں اور جب بڑی سیٹھانی جنت کو سدھاریں تو اس نے کھڑے ہو کر اپنے سامنے قبر کھدوائی جب پہلی مرتبہ چھوٹی سیٹھانی کا حمل دور ہوا تھا تو نرس کو بلا کر وہی لایا تھا۔ اور پھر جب دوسری مرتبہ ان کی گود ہری ہوئی تھی تو آدھی رات کے وقت علودائی

کے دروازے کی کنڈی بھی اسی نے کھٹکھٹائی تھی۔ اس کے بعد جب وہ صحنک میں بیٹھیں تو کھیر کے لئے دودھ اور چاول وہی خرید کے لایا اور جب دینے والے نے اپنی چیز واپس لی تو کافور اور لٹھا بھی وہی خرید کے لایا۔ اسے کام سے مطلب تھا نہ کہ کام کی نوعیت سے۔ یوں سمجھئے کہ مجیدا اگر ادیب ہوتا تو ادب برائے ادب کے نظریئے کا قائل ہوتا۔ آٹھ کی شب کو بڑے علم کے چڑھاوے کے لئے جو شخص سیدانی جی کو کھیلیں بتاشے لا کر دیتا تھا وہ مجیدا ہی تھا۔ اور جس شخص نے ان کی مرغی کو بلی کے منہ سے چھینا تھا وہ بھی مجیدا ہی تھا۔ ان کی دوباری میں مرغیوں کا جو ڈربا بنا ہوا تھا اس کے لئے چکنی مٹی دراصل اسی نے فراہم کی تھی۔ اور اس کے بدلے میں اسے گود بھر دعائیں ملی تھیں۔ یوں حاجی گلزباغ علی کے کوٹھے پر جو کابک بنی ہوئی تھی وہ بھی بڑی حد تک اسی کی بھاگ دوڑ کی مرہون منت تھی۔ مگر حاجی جی دعائیں تو کیا دیتے شکریہ کا بھی ڈیڑھ لفظ نہ کہا۔ اسومیاں مجیدا کے احسانات کا بدلہ گالیوں سے چکاتے تھے۔ تھوڑی بہت اگر کسر رہ جاتی تھی تو اسے چھوٹی سیٹھانی کی ہائے توبہ پورا کر دیتی تھی۔ اکثر ہوتا یوں ہے کہ چھوٹی سیٹھانی قسم کی عورتوں کے شوہر بڑے گوبر گنیش ہوتے ہیں۔ لیکن اسومیاں تو چھوٹی سیٹھانی سے پھسڈی رہ جانے میں اپنی کسر شان سمجھتے تھے۔ مجیدا کو انہوں نے زر خرید غلام سمجھ رکھا تھا۔ جہاں ذرا سی چوک ہوئی اور انہوں نے لعن طعن شروع کی یہ مورچہ ختم ہوتا تو اندر سے توپ دغنے لگتی تھی۔ چھوٹی سیٹھانی سے خدا بچائے' سات پشتوں کو اکھاڑ ڈالتی تھیں ۔ ممکن ہے بعض لوگ یہ سمجھتے ہوں کہ مجیدا ان کا نوکر ہے ۔ مگر توبہ کیجئے' اسومیاں کو نوکر رکھنے کی کب توفیق ہوئی تھی۔ یوں سیٹھ صاحب اچھی خاصی جائیداد چھوڑ گئے تھے۔ مگر ان کی بند مٹھی کبھی کسی نے کھلتے نہ دیکھی اور چھوٹی سیٹھانی خود دانت سے پیسہ پکڑتی تھیں۔ مجیدا سے کام لینے میں انہوں نے کبھی بخل نہیں کیا۔ لیکن یہ کبھی نہ ہوا کہ روپے دو روپے سے ہاتھ اٹھ جاتا۔ کھانے کا یہ تھا کہ حاضر میں حجت نہیں۔ مجیدا وقت پر ہوا تو کھانا کھا لیا' دیر سویر سے آیا تو وہ بھی غائب۔ وہ تو اس کی قائل تھیں کہ باسی بچے نہ کتا کھائے۔ ہاں محرم میں وہ ضرور اللے تللے سے خرچ کر دیتی تھیں مگر وہ تو سیٹھ صاحب وقف چھوڑ گئے تھے' وہ خرچ کرنا ہی تھا۔

عزاداری کا ثواب تو اسومیاں اور چھوٹی سیٹھانی کو پہنچتا تھا۔ اور بیر دوڑی مجیدا کو کرنی پڑتی تھی۔ امام باڑے میں سفیدی بھی وہی کراتا تھا اور چھ کی شب کو چھوٹی سیٹھانی کے لاڈلے کے لئے چاندی کی ہنسلی بھی وہی بنوا کے لاتا تھا۔ امام باڑے میں روز رات کو مجلس ہوتی تھی مگر وہ مجلس میں بیٹھا کبھی نظر نہیں آیا۔ وہ امام باڑے کے پیچھے والے دالان میں تنور پر بیٹھا نان لگتے دیکھتا تھا۔ ہاں تبرک بٹتے وقت وہ پھاٹک پر کھڑا نظر آتا تھا۔ تبرک تو خیر حاجی گلزباغ علی بانٹتے تھے لیکن نانوں کی سینی لے کر مجیدا ہی کھڑا ہوتا تھا۔ کوٹھی کٹھلے کو ہاتھ لگانے کی اجازت مجیدا کو مطلق نہ تھی مگر وہ تو تنور پر بیٹھ کر اور نانوں کی سینی تھام کر ہی یہ سمجھ لیتا تھا کہ گھربار اس کا ہے۔

جج صاحب سے مجیدا کو جو اللہ مارے کا بیر ہو گیا تھا شاید اس کی وجہ یہی تھی کہ ان کے یہاں اسے اس قسم کا فخر حاصل کرنے کا موقعہ کبھی میسر نہ آیا۔ اس نے حسب عادت مختلف موقعوں پر مختلف کاموں میں ٹانگ اڑانے کی کوشش ضرور کی تھی۔ مگر جج صاحب کے نوکروں کے سامنے بھلا کس کی دال گلتی تھی۔ جج صاحب تو خیر اپنی ریاست میں رئیس تھے ہی لیکن ان کے نوکر ان سے زیادہ رئیس تھے۔ اور کرامت نے تو حد ہی کر رکھی تھی۔ جج صاحب کی خدمت گاری کو اس نے نہ جانے کیا سمجھ رکھا تھا۔ کالے آدمی سے بات نہیں کرتا تھا۔ مجیدا کے مختلف اقدامات کو اس نے براہ راست اپنے اختیارات پر حملہ تصور کیا۔

مجیدا کے مزاج میں جتنی انکساری تھی اتنا ہی ٹھسا بھی تھا۔ پیار سے اس کے کپڑے اتار لو لیکن جہاں ذرا کسی نے ٹیڑھی آنکھ سے دیکھا تو وہ بھی تن پھن ہو جاتا تھا۔ جج صاحب کی رعونت اور کرامت کی لاڈ صاحبی اسے ایک آنکھ نہ بھائی۔ شبراتی کبابی کے چبوترے پر بیٹھ کر اس نے اعلانیہ کہا کہ "یارو جج صاحب اللہ پاک کی قسم بہت سفلہ ہے"۔ اس سفلہ پن کا سب سے بڑا ثبوت اس نے پیش کیا کہ جج صاحب کے چھوٹے لڑکے کی مسیں بھیگ چلی تھیں اور اب تک انہوں نے اس کا عقیقہ نہیں کرایا تھا۔ جب بائیس رجب کو مجیدا اور شبراتی ایک پورے جلوس کے ساتھ کونڈے کھانے نکلے اور شبراتی

نے جج صاحب کے گھر کا ذکر کیا تو مجیدا نے ایک مرتبہ پھر ان کے سفلہ پن پر گفتگو کی اور کہا۔ "اے یار کس کا ذکر کرے ہے۔ جج کونڈے کرے گا ابے گھاس کھا گیا ہے تو"۔

جج صاحب کا سفلہ پن اس کی وجہ ہویا ان کی رعونت مجیدا نے بہر صورت انکی ڈیوڑھی پر قدم رکھنے کی قسم کھالی۔ چنانچہ جب ان کے بڑے بیٹے کی شادی ہوئی۔ تو اگرچہ ولیمہ میں دنیا پہنچی مگر مجیدا وہاں جاکر نہ جھانکا۔ شبراتی بھی ولیمہ میں گیا۔ اور پلٹا تو زردہ اور فیرنی کا قصیدہ پڑھتا ہوا پلٹا۔ مجیدا کو اس کی اس روش پر سخت طیش آیا۔ اس نے اسومیاں کی شادی کا حوالہ دے ڈالا۔

"میاں دس وخت سیٹھ صاحب زندہ تھے ونہوں نے کمال کر دیا۔ ساتوں کھانے دیئے۔ برادری کا بچہ بچہ پیٹ بھر کے گیا"۔

"مگر پیارے کھانا جج صاحب نے بھی بہت بڑھیا دیا ہے"۔ شبراتی فیرنی اور زردے کا مزہ اتنی جلدی کیسے بھول جاتا۔

مجیدا کو اور تاؤ آیا۔ "ہٹ یار۔ جج ویسا کھانا کیا کھا کے دے گا۔ قسم قرآن کی قورمہ میں بالشت بالشت بھر تار کھڑا تھا۔ دس کے بعد چاندی کی رکیبیوں میں مٹھائی ساری برادر میں بٹی"۔

شبراتی حق نمک ادا کرنے پر تلا ہوا تھا۔ لیکن مجیدا نے سیٹھ صاحب کے ولیمہ کا اس طنطنہ سے ذکر کیا کہ شبراتی کی ساری دلیلیں دھری رہ گئیں اس موقعہ پر ہی نہیں دوسرے موقعوں پر بھی اس نے مجیدا سے شکست فاش کھائی تھی۔

جج صاحب کے چھوٹے بیٹے کے پہلے روزے پر جب مسجد میں افطاری تقسیم ہوئی تو شبراتی نے ایک مرتبہ پھر جج صاحب کی مدح سرائی کی ٹھانی اور پھر مجیدا سے منہ کی کھائی۔ شبراتی افطاری کی بریانی سے بہت متاثر تھا۔ لیکن مجیدا نے اس کی بات کاٹ دی۔ "ہٹ یار یو جج بڑا کنجوس مکھی چوس ہے۔ اللہ رسول کے نام یہ یو کیا دے گا"۔

"کچھ ہی کہو بھیا افطیاری تو دس نے ٹھاٹھ کی دی ہے"۔

مجیدا اس پر بہت تن پھنایا۔ "یار یو افطیاری تھی؟ اماں اختیاری سیٹھ صاحب نے

دی تھی جب اسو میاں نے روزہ رکھا تھا۔" اور اس نے اس افطاری کا اس شان سے نقشہ کھینچا کہ شبراتی کا سارا جوش جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ معلوم نہیں۔ مجیدا کو اسو میاں کی کون سی ادا بھائی تھی۔ ویسے تو وہ ہمیشہ اسے گالیاں ہی دیتے دیکھے گئے۔ اسو میاں مجیدا کو سب سے زیادہ گالیاں دیتے تھے اور مجیدا اسو میاں کا سب سے زیادہ کام کرتا تھا۔ جتنا وہ کام کرتا تھا اتنی ہی گالیاں دیتے تھے اور جتنی وہ گالیاں دیتے تھے اتنی ہی وہ ان کی تعریف کرتا تھا۔ ان معنوں میں جج صاحب بڑے بدقسمت تھے۔ انہوں نے مجیدا سے نہ تو کوئی کام لیا اور نہ اسے کبھی گالی دی اور نہ مجیدا نے ان کی کبھی تعریف کی۔ اسے محض اتفاق سمجھئے کہ کرامت چلا گیا۔ اور جب اس کی بجائے کوئی نوکر نہ ملا تو انہیں مجیدا یاد آیا۔

مجیدا کو جب پتہ چلا کہ جج صاحب اسے بلاتے ہیں تو وہ ماش کے آٹے کی طرح اینٹھ گیا۔ کئی ایک پیغاموں کو تو وہ پی گیا۔ لیکن جب جج صاحب کا آدمی بار بار اسے بلانے آیا تو پھر وہ منع نہ کر سکا۔ جج صاحب کے گھر جاتے ہوئے وہ خاص طور پر شبراتی کی دکان کی طرف سے گذرا۔ ایک ڈیڑھ منٹ دکان پر کھڑے ہو کے اس نے بڑی عجلت میں حقہ کے چند گھونٹ بھرے۔ اور پھر چلتے ہوئے کہنے لگا۔ "یار دے جج صاحب نے تڑیائی لگا رکھی ہے۔

مجیدا بڑی فتح مندی کے احساس کے ساتھ جج صاحب کے یہاں پہنچا تھا۔ لیکن جب لوٹا تو اس کا انداز بدلا ہوا تھا۔ واپسی میں وہ پھر شبراتی کی دکان پر رکا اور چبوترے پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "یار یو جج بڑا فرعون بے سامان بنا پھرے ہے۔ قسم اللہ پاک کی اب تو میں دس کی ڈونڈھی پر قدم نئیں رکھوں گا۔

"کیا ہوا بے؟" شبراتی نے سوال کیا۔

"یار حد ہو گئی"!

"کیا حد ہو گئی؟ منہ سے پھوٹ نا" شبراتی کچھ جھنجلا سا گیا۔

"یار میں واں گیا تو بولا تمہارا نام ہے مجیدا؟ میں نے کہا کہ ہاں جی۔ میں مجیدا ہوں"۔

شبراتی نے اسے ٹوکا"۔ ابے سالے اس میں لاڈصابی کی کیا بات ہے ۔ اسومیاں تو تجھے ہیشہ تو تڑاخ کریں ہیں۔ ونہوں نے تجھے تم تو کہہ دیا"۔

"سن تو سہی بے"۔ مجیدا جھنجلایا۔" پھر کیا کہویں ہیں...... وہ رکا اور پھر سنبھل کر بولا۔" کہنے لگے کہ بھئی نوکری کرو گے؟........ حد ہے یار......"

مجیدا خاموش ہو گیا۔ اس نے حقے کی نے ہونٹوں میں دبالی ۔ دو تین گھونٹوں کے بعد وہ پھر بڑبڑایا۔" حد ہو گئی یار" اور پھر خاموشی سے حقہ پینے لگا۔

۱۹۵۳ء

بیریم کاربونیٹ

یہ تو یہاں کسی کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ ایسا ہو جائے گا۔ شک اندیشے اور شکایتیں ضرور تھیں لیکن وہ دوسری قسم کی تھیں۔ اور وہ بھی بعد میں پیدا ہوئیں ۔ شروع میں تو جسے یہاں کوارٹر مل گیا سمجھا کہ جنت مل گئی ۔ حالانکہ اس وقت شکایتوں کی زیادہ گنجائش تھی ۔ بجلی ابھی نہیں آئی تھی ۔ سڑک بھی نہیں بنی تھی ۔ آدھ پون میل تک کچے پکے رستے طے کرتے ہوئے سڑک تک جاتے تب کہیں بس سٹینڈ کی صورت نظر آتی اور بس کا یہ عالم کہ کھڑے کھڑے ٹانگیں دکھ جاتیں اور اس کی شکل دکھائی نہ دیتی ۔ مگر اشرف چاچا یہ خبر لائے تھے کہ سڑک اگلے مہینے سے بننا شروع ہو جائے گی۔ اور اس کے بعد بس یہاں اندر تک آیا کرے گی اور پندرہ پندرہ منٹ کے بعد چلا کرے گی۔ ان معاملات میں اشرف چاچا سے زیادہ باخبر کون ہو سکتا تھا انہوں نے کہا ہم نے مان لیا۔ اس سے قطع نظر امپرومنٹ ٹرسٹ والے آخر آدمی تھے' الہ دین کا چراغ تو ان کے پاس نہیں تھا کہ راتوں رات کوارٹر بھی بن جاتے اور بجلی بھی لگ جاتی اور سڑک بھی تیار ہو جاتی اور بس سروس بھی شروع ہو جاتی۔ یوں اگر سوچو تو الہ دین کا چراغ بھی اس سے زیادہ کیا تاثیر دکھاتا ہم نے کیا تعمیر ہوتے دیکھی نہیں ہے۔۔ دو پہروں پہ دوپہریاں گذری چلی جاتیں اور راج مزدور اسی ایک رفتار سے روڑے توڑتے رہتے ' بجری بچھاتے رہتے ' اینٹوں سے لدے پھندے گدھے اور گارا بھری پراتیں اٹھائے مزدور قطار قطار آتے رہتے جاتے رہتے ' لگتا

کہ یہ سلسلہ یوں ہی جاری رہے گا۔ پر بالآخر ایک دن مکان بن کر تیار ہو جاتا' پھر اسی رفتار سے کنوئیں کی کھدائی شروع ہوتی اور جب زمین کھدتے کھدتے پانی کی تہہ دکھائی دیتی تو بتاشے بٹتے پھر ایک رات وہاں گیس کے ہنڈے رکھے جاتے' جاجم اور چاندنی بچھتی' اگربتیاں سلگتیں اور میلاد منعقد ہوتا۔ اس کے بعد گھر آباد ہونا شروع ہوتا' مگر ہمارے یہ کوارٹر دیکھتے دیکھتے تیار ہوئے اور تیار ہونے سے پہلے آباد ہوئے' کتنے کوارٹر ایسے تھے کہ قلعی تو کیا پلستر تک نہیں ہوا تھا۔ اور لال رنگ دیواریں ننگی ننگی نظر آتی تھیں۔ ایسے بھی کوارٹر تھے کہ چوکھٹیں تو لگ گئی تھیں مگر کنواڑ نہیں چڑھے تھے اور اجلے برآمدوں میں بوھئی دن رات ٹھوک پیٹ کرتے تھے۔ مگر جنہیں یہاں آباد ہونا تھا بہرصورت آباد ہوئے جیسے قصبوں میں شام پڑے کسی کسی دوکان میں اندھیرا ہونے سے پہلے ہی چراغ جل جاتا ہے' پھر اس کی دیکھا دیکھی تین چار دوکانیں چھوڑ کر کسی دوکان کا لیمپ روشن ہو جاتا ہے' اور پھر دوکانوں کی لالٹینیں اور لیمپ اور سرسوں کے تیل والے چراغ جلتے چلے جاتے ہیں اور ہوتے ہوتے سارا بازار منور ہو جاتا ہے اسی انداز سے ہماری کالونی آباد ہوئی۔ کاٹھ کباڑ سے بھرے ٹھیلے اور ٹبر سے بھرے تانگے آج اس کوارٹر کے سامنے کھڑے ہیں کل اس کوارٹر کے سامنے جاکر رکے ہیں۔

بس ہماری کالونی دیکھتے دیکھتے آباد ہو گئی۔ اور اب کسی کو یہ بھی یاد نہیں کہ کون کب آیا تھا۔ البتہ بعض خاص واقعات سب کے ذہنوں پر نقش ہیں۔ مثلاً یہ سب کو یاد ہے کہ اس کالونی میں پہلی لڑائی وہ تھی جو سیدانی جی کی انبالہ والی سے ہوئی تھی۔ سیدانی جی پہلے انبالہ والی سے لڑیں۔ پھر دلی والی سے ٹھنی۔ مگر وہ دونوں زبر نکلیں۔ سیدانی جی چند دنوں تنی رہیں مگر پھر آپ ہی آپ پانی ہو گئیں اور اعلان کر دیا کہ بی بی مجھے یہاں کتنے دن رہنا ہے۔ میں تو کربلائے معلی چلی بھی گئی ہوتی۔ مگر محسن کی پڑھائی بیچ میں آپڑی۔ امریکہ والا اسے وظیفے پر بلا رہا ہے۔ وہ امریکہ ہو آوے میں تو یہاں کھڑی پانی نہیں پیوں گی۔ دو بول نکاح کے پڑھوا کے کہدوں گی کہ بیٹا اپنا گھر سنبھالو۔ ماں کو عاقبت کی فکر کرنے دو۔

عجب بات ہے کہ کربلائے معلی جانے کی بات ہمارے سب ہی کے ذہن سے اتر گئی۔

یا تو یوں کہئے کہ انبالہ والی اور دلی والی نے دوسری بات کا چرچا زیادہ کر دیا کہ جس کوارٹر گئیں یہ اطلاع پہنچانا اپنا فرض سمجھا کہ سیدانی کا پوت امریکہ جا رہا ہے یا یوں سمجھ لیجئے کہ بیٹے کے ارادے میں ماں سے زیادہ خلوص اور گرمی تھی۔ محسن کو ہر چند کچے رستے اور بسوں سے سخت شکایت تھی مگر سائیکل خریدنے کا سوال کبھی نہ اٹھایا کہ کہیں وہی اس کے اٹھے ہوئے قدم نہ پکڑ لے۔ اور سیدانی جی تھیں کہ کربلا جانے کا اعلان بھی کرتی رہتی تھیں اور گھر کے کاروبار کو پھیلاتی بھی جاتی تھیں۔ مرغیاں تو انہوں نے پہلے آتے ہی خرید لی تھیں۔ پھر نیم بھی لگا لیا تھا کہ جب یہ بڑا ہو جائے گا۔ تو اس کے سائے میں تندور کھودیں گی۔

ہمیں تو یوں لگتا ہے کہ یہ واقعہ نہ ہو گیا ہوتا تو سیدانی جی کربلائے معلی' کو بھول بھی چکی ہوتیں۔ یہاں کی رہائش میں جو دقتیں تھیں ان سے تو محسن کو دوچار ہونا پڑتا تھا۔ سیدانی جی کے لئے تو آرام ہی آرام تھا' سب سے بڑا آرام تو یہ تھا کہ پچھواڑے رام گڑھ کے کھیت لگے ہوئے تھے جہاں سے سبزی ترکاری تازہ اور سستی مل جاتی تھی۔ ایک سبزی ترکاری پہ کیا موقوف ہے' کھانے پینے کی بہت سی چیزیں سستی مل جاتی تھیں۔ باریک چاول کی مثال لیجئے کتنا مہنگا ہو رہا ہے اور جن دنوں سیدانی جی نے خریدا ہے ان دنوں تو وہ کسی بھاؤ بھی نہیں ملتا تھا۔ مولا کا حوالہ دے کر انہوں نے ایک کاشتکار سے خریدا تھا۔ یہ چاول کس اہتمام سے خریدے گئے اور کس احتیاط سے سنبھال کر رکھے گئے مگر جو ہونا ہوتا ہے ہو کر رہتا ہے پہلے وہ باورچی خانے میں رکھے گئے تھے۔ مگر جب باورچی خانے میں چوہوں کا عمل دخل ہونے لگا تو بوری سے نکال کر انہیں دیگچے میں بھرا گیا۔ دیگچا سامان والے کمرے میں لکڑی کے بڑے صندوق میں جس میں چینی کے برتن رکھے تھے رکھا گیا' اس پر رکابی ڈھکی گئی اور صندوق میں تالا پڑ گیا۔

ہماری کالونی میں چوہوں کا آنا اور پھیلنا بھی اک داستان ہے۔ ان کی ابتداء بھی عجب تھی انتہا بھی عجب ہے ابتداء سیدانی کے باورچی خانے میں رکھی ہوئی جالی کے نیچے کے خانے سے ہوئی۔ جالی اس رات کھلی رہ گئی تھی صبح کو ڈھکن کئی دیگچیوں کے گرے ہوئے

گئی کے ادھ کھلے پائے گئے۔ رات کے چائے سے بچا ہوا تھوڑا دودھ کہ دودھ دانی میں رکھا تھا اوندھا ہوا تھا اور دودھ دانی لڑھک گئی تھی۔ سیدانی جی نے اس کا سارا الزام انبالہ والی کی صندلی بلی کے سر تھوپ دیا جس پر اس روز سے اس گھر کے دروازے بند ہو گئے۔

پھر ایک دن دودھ کی دیگچی سے دودھ دانی میں دودھ انڈیلتے ہوئے کالا کالا نقطہ سا نظر آیا۔ سیدانی جی کو شک پڑا' غور سے دیکھا تو شک یقین سے بدل گیا اس کی بلا دودھ والے کے سر گئی۔ سیدانی جی اس پر بہت بگڑیں کہ مینگنی کے لئے ہمارا ایمان خراب کرتا ہے۔ اس نے اپنی صفائی بہت پیش کی لیکن سیدانی جی کے سامنے ایک پیش نہ گئی۔ وہ یہ کیسے تصور کر سکتی تھیں کہ ان کے نئے کوارٹر میں جس کے ہر کمرے کا اور باورچی خانے کا فرش پکا ہے اور کہیں کوئی بل نہیں ہے چوہے بھی ہو سکتے ہیں۔ ہاں کوارٹر کے پچھواڑے جہاں جھاڑیاں اور گھاس پھونس ہے اور اب آس پاس کے کوارٹروں کا کوڑا مستزاد ہے کہ دن بھر سیدانی جی کی مرغیاں اسے کریدتی اور دانہ دنکا چگتی رہتی ہیں باورچی خانے کی کھڑکی سے کوڑا پھینکتے ہوئے انہوں نے ایک لمبی سی دم جھاڑی میں بل کھاتی ضرور دیکھی تھی مگر ہر چند کہ زندگی میں انھیں بارہا چوہے کی دم پر سانپ کی دم کا اور سانپ کی دم پر چھپکلی کی دم کا شک ہوا ہے اس دم کو دم کے دم میں پیلی سے لال پڑتے دیکھ کر وہ پہچان گئی تھیں کہ گرگٹ ہے اور اگرچہ وہ گرگٹ کو جس نے حضرت عباس کا مشکیزہ کترنے کا گناہ کیا تھا' زندہ چھوڑنے کی قائل نہیں ہیں مگر اس وقت باورچی خانے کی دیوار بیچ میں حائل ہونے کی وجہ سے وہ کوئی کارروائی اس کے خلاف نہیں کر سکی تھیں بہرحال لے دے کے یہ ایک دم تھی جو انہیں اس کوارٹر میں رہتے ہوئے دکھائی دی تھی۔ وہ دودھ والے کی بات کا اعتبار کیسے کر لیتیں۔

مگر ایک دن یوں ہوا کہ جب انہوں نے باورچی خانے میں قدم رکھا تو ایک اضطراب کے ساتھ برتن بجے اور اک شے بجلی کی تیزی سے برتنوں سے نکل کر جالی کے نیچے جاتی دکھائی دی۔ سیدانی جی بھی اسی پھرتی سے پلٹیں' صحن میں رکھا ہوا لمبا بانس اٹھایا اور باورچی خانے میں جاکر جالی کو کھٹکھٹانا شروع کیا' نتیجہ صرف اتنا نکلا کہ وہ لمبی دم جو پہلے جالی

کے پیچھے دکھائی دی تھی نالی میں دکھائی دی اور دم کے دم میں گم ہو گئی۔ اس روز انہیں معلوم ہوا کہ خرابی باہر کی نہیں باورچی خانے کے اندر ہو رہی ہے۔ مگر اس وقت بھی وہ یہی سمجھیں کہ کہیں باہر سے کوئی چوہا بھٹک کر آ گیا ہے اور اگر اس کا قلع قمع کر دیا جائے تو باورچی خانے میں پھر سے امن قائم ہو سکتا ہے' چنانچہ انبالہ والی کی صندلی بلی جو کل تک معتوب تھی خاص طور پر انبالہ والی سے منگوا کر رات کو باورچی خانے میں بند کی گئی۔

صبح کو جب باورچی خانے کا دروازہ کھولا گیا تو خرابی کی جڑ کے مٹنے نہ مٹنے کے متعلق تو تحقیق نہ ہو سکی۔ ہاں یہ پایا گیا کہ خود صندلی بلی کی بدولت باورچی خانے کی ہنڈیوں دیگچیوں اور رکابیوں کا نظم و نسق تباہ ہو چکا ہے۔ دوسری رات سیدانی جی نے ہنڈیا' دیگچیاں اور چینی کے برتن احتیاط سے جالی میں بند کر دیے۔ پس صندلی بلی باورچی خانے کے امن میں اس رات خلل نہ ڈال سکی' البتہ صبح باورچی خانے سے نکلتے ہوئے وہ آنگن میں گھومتی ہوئی بے پرواہ مرغیوں میں خوف و ہراس پیدا کر گئی۔ سیدانی جی کی بروقت مداخلت نے جانی نقصان نہیں ہونے دیا مگر مرغیاں دیر تک ہراس کے ساتھ چلاتی رہیں۔ اس روز سے سیدانی جی کا بیرونی امداد سے اعتبار اٹھ گیا۔

دوسرے دن انہوں نے محسن کو روپیہ دیا اور کہا کہ نحوست مارا چوہا کہیں سے آ گیا ہے تو مجھے چوہیدان لا دے محسن کو تو خیر چوہے دان خریدنا اور ہاتھ میں لیکر چلنا گوارا نہ ہوا اشرف چاچا اس موقعہ پر کام آئے اور نصرو ٹین ساز کی دوکان سے ایک چوہے دان خرید کر سیدانی جی کو پہنچا دیا۔ سیدانی جی نے اسی رات روٹی کا ٹکڑا اس کے کانٹے میں لگایا اور باورچی خانے میں رکھ دیا۔ صبح کو اٹھیں تو ایک موٹے سے چوہے کو اس میں مقید پایا۔ اس قیدی کو ٹھکانے لگانے کا ذمہ دلی والی کے لونڈے نے لیا جو چوہے دان ہاتھ میں لئے آگے آگے جاتا تھا' پیچھے لونڈوں کا ایک ہجوم تھا اور کئی کوارٹر والیاں باہر نکل آئی تھیں' اور سیدانی جی کے مجرم کو یوں دیکھ رہی تھیں جیسے مسجد سے کوئی جوتیاں چراتا ہوا پکڑا گیا ہو۔ لونڈوں کی یہ پلٹن کوارٹروں کے پچھواڑے دور کھیتوں کی طرف نکل گئی۔ جب یہ پلٹن واپس آئی تو سیدانی جی کو اپنے مجرم کے انجام کا تو پتہ چل گیا مگر یہ پتہ نہ چل سکا کہ چوہے

دان کا کیا ہوا۔

اس کے بعد باورچی خانے کا امن واقعی کچھ بحال ہوتا نظر آنے لگا۔ ویسے اب سیدانی جی ہر چیز سنبھال کر جالی میں بند کرتی تھیں' چوہے کا اندیشہ نہ سہی انبالہ والی کی صندلی بلی کا کھٹکا تو بدستور تھا۔ ایک مرتبہ دال کی ہنڈیا رات کو جالی سے باہر رکھی رہ گئی تھی۔ صبح سیدانی جی نے دیکھا کہ چپنی الگ پڑا ہے اور دال کی جمی ہوئی تہہ پر زنجیرا بنا ہوا ہے انہوں نے نظر اٹھا کر روشندان کی طرف دیکھا اور سوچا کہ شاید چڑیا اندر آگئی تھی اس زنجیرے کو وہ چڑیا کے پنجوں اور چونچوں کے نشان سمجھیں۔ پھر جب انہوں نے غسل خانے میں محسن کی میلی قمیض کو کترا ہوا پایا تو یاد آیا کہ وہ پچھلی مرتبہ اسے دھوبی کے ڈالنا بھول گئی تھیں۔ اور بڑبڑانے لگیں کہ طاعون مارا غسل خانے تک میں پہنچ گیا تھا۔ بچے کی ساری قمیض چھلنی کر دی۔

اصل حال کہیں محرم میں جا کر کھلا۔ سیدانی جی نے آٹھ کی شب کو پلاؤ کی حاضری کرنے کا اعلان کر رکھا تھا۔ یہ اعلان وہ عجب ماتمی انداز میں کرتیں۔ انہیں اپنا امام باڑہ یاد آجاتا۔ اس میں سجے ہوئے سونے چاندی کے علم اور چھت میں ٹنگے ہوئے جھاڑ فانوس ہانڈیاں اور لیمپ یاد آتے' وہاں ہونے والی مجلسوں کا تذکرہ کرتیں جہاں دسوں دن نان قیمہ تقسیم ہوتا تھا' آٹھ کی شب کو ہونے والی حاضری کا نقشہ کھینچتیں جس میں خلقت ٹوٹتی تھی اور شیرمال قورمہ سے سیر ہو کر جاتی تھی۔ عجب بات ہے کہ پہلے کوارٹر والی وہیں کی رہنے والی ہے وہ کہتی ہے کہ سیدانی جی کے یہاں نان قیمہ بٹنا تو اسی سال بند ہو گیا تھا جس سال راشن ہوا تھا۔ اور شیرمال قورمے کی حاضری کے متعلق کہتی ہے کہ میاں ہم نے تو جب سے ہوش سنبھالا سیدانی کے گھر پلاؤ کی حاضری ہوتے دیکھی کہتے ہیں جب ان کے خسر زندہ تھے تو شیرمال قورمے کی حاضری کرتے تھے۔ بہرحال عذاب ثواب کہنے والوں کی گردن پر ہم نے جو سنا ہے دہراتے ہیں۔ ویسے سیدانی جی نے اس کوارٹر میں آکر بھی دسوں دن مجلسیں کیں اور جلیبیاں بانٹیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ ان مجلسوں کی وہ دھوم نہ تھی جو وہ اپنے امام باڑے کی مجلسوں کی بیان کرتی ہیں۔ اول تو وہ مردانہ سے زنانہ مجلسیں بنیں اور زنانہ مجلسیں

بھی ایسی کہ بس آس پاس کی کوارٹر والیاں وہاں پہنچتی تھیں اور رقت بہت کم ہوتی تھی البتہ آٹھ تاریخ کی حاضری کی شہرت کالونی بھر میں ہو گئی تھی اور ہم سب پلاؤ کھانے کے لئے ذہنی طور پر تیار ہو چکے تھے۔ مگر آٹھ تاریخ کو جو ہوا اس کا کسے گمان تھا۔ سیدانی جی ایسی سہم گئی تھیں کہ اور کوئی انتظام بھی نہ کر سکیں جب شام ہونے لگی تو انہوں نے اشرف چاچا کو بلوایا اور جلیبیوں کے لئے روپے دیئے۔ ہم حاضری کے نام ایک ایک دو دو جلیبی کھا کر چلے آئے کسی کے منہ سے ایک لفظ نہیں نکلا۔ واقعہ یہ ہے کہ ہم سب دہل گئے تھے۔

پہلے کوارٹر والی کو کچھ اعتبار نہیں آرہا تھا۔ انبالہ والی نے اسے یقین دلانے کے لئے اپنی عینی شہادت پیش کی 'مّیا میں تو خود دیکھ کے آئی ہوں۔ صندوق میں یہ بڑا مکا کھلا ہوا تھا " اور ساتھ میں اس نے دونوں ہاتھوں کے انگوٹھوں اور شہادت کی انگلیوں کو جوڑ کر دائرے کا نشان بنایا۔

"بہنوں میں یہ پوچھوں ہوں کہ انہوں نے صندوق کو کیسے کتر لیا؟"

"اے لو صندوق کو کیسے کتر لیا" انبالہ والی بولی "صندوق آخر لکڑی کا تھا۔ اور مّیا یہ نحوست مارے تو عذاب الٰہی ہیں۔ کیا کھانے پہننے کی چیز کیا برتنے کی چیز کتر کے برباد کر دیتے ہیں"۔

دلی والی گم سم بیٹھی رہی۔ پہلے کوارٹر والی بھی سوچ میں پڑ گئی چپ بیٹھی رہی پھر بولی" کمبختوں کا پیٹ تھا یا مشک تھی۔ اتنے بہت سے چاول ....."

انبالہ والی بات کاٹتے ہوئے بولی "مّیا مجھے بھی اعتبار نہیں آیا تھا۔ سیدانی میرا ہاتھ پکڑ کے اندر لے گئی اور صندوق کھول کے دکھایا۔ جھوٹ مت جانیو کوئی مٹھی بھر چاول پڑے ہوں گے۔ باقی مینگنیاں" انبالہ والی کو جھرجھری آگئی۔

دلی والی نے ٹھنڈا سانس بھرا "اللہ رحم کرے"

پہلے کوارٹر والی آنکھیں پھاڑے دلی والی کو تکتی رہی، منہ سے کچھ نہیں بولی۔

اس رات سیدانی جی کی مجلس میں دور دور کے کوارٹر سے بیبیاں آئیں۔ مجلس دیر

تک رہی اور بہت رقت ہوئی۔ سیدانی جی کے واقعہ نے آس پاس کی کوارٹروالیوں کو چوکنا کر دیا۔ دلی والی نے دوسرے ہی دن اپنی بیٹی کا جہیز کھولا اور ریشمین کپڑوں کو دھوپ دینے کے لئے چارپائیوں پر پھیلا دیا۔ یہ کپڑے تو سب سلامت تھے۔ ہاں اپنا ڈوپٹہ جو کلف دیکر ادھ کھلی دراز میں رکھ دیا تھا کہ محرم بعد اس پر ستارے ٹانکے جانے تھے وہ جگہ جگہ سے کترا ہوا پایا گیا۔ انبالہ والی نے آٹا چھانا تو اس میں بھسی کم اور مینگنیاں زیادہ نکلیں۔ انبالہ والی اور دلی والی کو یہ بات سخت ناگوار گزری کہ سیدانی کے گھر کے چوہے ان کے گھر آجاتے ہیں۔ ان کا شک اور شکوہ جائزہ تھا۔ مگر حیرانی تو اس بات پر ہے کہ پیلا کوارٹر سیدانی جی سے بہت فاصلہ پر ہے، مگر پیلے کوارٹر والی کے کئی میلے کپڑے کترے ہوئے پائے گئے اور کمال تو اشرف چاچا کے ساتھ ہوا۔ کلیمز کے ئے جو درخواست وہ دے رہے تھے اس میں کاغذات کی تعداد اب اتنی ہو گئی تھی کہ پن جو مڑ تو پہلے ہی گیا تھا اب دو ٹکڑے ہو گیا۔ انہوں نے کاغذوں کے کونوں پر آٹا لگایا اور چپکا دیا۔ صبح کو ان سب کاغذوں کے کونے غائب تھے

کاغذوں کی تھوڑی بھسی میز پر بکھری ہوئی تھی۔ اشرف چاچا نے یہ ذکر نوا پرچونے کی دوکان پر آکر کیا۔ وہاں اس وقت مولوی عثمان علی مونڈھے پر بیٹھے عینک لگائے پیلے ورقوں والی اس کتاب کو دیکھ رہے تھے جس کے تین چوتھائی صفحے نوا پڑیاں باندھنے میں صرف کر چکا تھا۔ انہوں نے کتاب سے نظر اٹھائی اور بولے اماں کیا پوچھتے ہو۔ مثنوی مولانا روم کا ایک نادر نسخہ مطبوعہ تہران میرے پاس تھا۔ بے ایمانوں نے اسے کتر کر برادہ بنا دیا"۔

اشرف چاچا نوا کی دوکان سے سیدھے نصرو ٹین ساز کی دوکان پر گئے اور ایک چوہے دان خرید لیا ان کے اس اقدام کی ہم سب نے پیروی کی اور چوہے دانوں کی خریداری عام ہو گئی۔ نصرو ٹین ساز نے ایک دن کے اندر اندر چوہے دان اتنے بیچے کہ دوسرے دن جب سیدانی جی نے دلی والی کے لونڈے کو برا بھلا کہنے کے بعد چوہے دان منگایا تو قیمت اس کی ایک روپے سے سوا روپے ہو چکی تھی۔ سیدانی جی نے چوہے دان واپس کرا دیا اور نصرو کی بے ایمانی کی علی الاعلان مذمت شروع کر دی دلی والی نے انہیں سمجھایا کہ سیدانی جی

چوہیدان مہنگے ہو گئے ہیں۔ مجھے بھی سوا روپے کا ملا ہے بی بی کیا کیا جائے میں نے تو چار چوہے دان منگا لئے ہیں اور ہر کمرے میں ایک ایک رکھدیا ہے''۔

سیدانی جی کا پارہ اس وقت اتنا چڑھا ہوا تھا کہ دلی والی کی بات نے ذرا اثر نہ کیا۔ دوسرے دن پارہ خود بخود اتر گیا اور انہوں نے سوا روپیہ لیکر محسن کو نصرو کی طرف بھیجا۔ مگر اس وقت چوہے دان کا بھاؤ ڈیڑھ روپے ہو چکا تھا ہم یہ کہتے ہیں کہ چوہے دان اس بھاؤ بھی سیدانی جی کو سستا ہی پڑا۔ اس کے بعد تو یہ حالت ہوئی ہے کہ ڈھائی ڈھائی روپے کا چوہے دان بکا ہے۔ اور خریداروں کا وہ ہجوم کہ خدا کی پناہ۔ نصرو ہوا کے گھوڑے پر سوار تھا' اعلان کر دیا کہ قطار بناؤ ' سب کو نمبرواری دوں گا۔ اس روز سے نصرو کی دوکان کے آگے قطار بننے لگی اور جوں جوں دن گزرے یہ قطار لمبی ہوتی گئی۔ ایک دن یہ قطار اتنی لمبی ہوئی کہ بکھر گئی اور ہجوم دوکان پر ٹوٹ پڑا اس پر نصرو نے تھانے والوں کو خبر کی جنھوں نے آکر ہلکا لاٹھی چارج کیا اور مجمع منتشر کر دیا۔

اشرف چاچا کو نصرو کی یہ روش بہت ناگوار گزری۔ انہوں نے اعلان کر دیا کہ نصرو نے بہت چوہے دان بیچے اب اس کے لئے چوہے دان تیار کرنا پڑے گا۔ چنانچہ اسی دن انہوں نے ہم سب کے دستخط لے کر نصرو کے خلاف ایک درخواست داغ دی۔ اس درخواست پر فوری کارروائی ہوئی اور چوہے دانوں کا کنٹرول ہو گیا۔ چوہیدان کا کنٹرول ریٹ ڈیڑھ روپیہ مقرر ہوا تھا مگر اس ریٹ پر کالونی کے بس دو تین آدمیوں کو چوہے دان مل سکے اس کے بعد نصرو نے اعلان کر دیا کہ مال ختم ہو گیا۔ نصرو نے صاف جھوٹ بولا کیونکہ اسی شام کو اس نے مولوی عثمان علی کو ڈھائی روپے میں چوہے دان دیا ہے۔ مولوی عثمان علی کی ایمانداری اور پرہیز گاری کا لحاظ کر کے اس نے یہ قیمت لگائی تھی ورنہ اس کے بعد اس نے تین تین روپے میں بیچا ہے۔

ہم نے کہا ''اشرف چاچا چوہے دانوں کی بلیک ہو رہی ہے''۔

معلوم ہوا کہ اشرف چاچا پہلے ہی پھنکے بیٹھے تھے ' بولے ' بیٹا کیا بتائیں باہر بلیک گھر میں سمگلنگ ہم دو کے بیچ میں پس گئے۔ میں نے کیمز والوں سے کہا کہ یارو خدا کے بندو '

نہ دینا کچھ ' درخواست تو رکھ لو ورنہ یہ جائیداد کے کاغذ چوہے سمگل کر لیں گے۔ مگر وہاں ایک سے ایک بڑا فرعون بیٹھا ہے کسی نے نہیں سنا"۔

اصل میں اشرف چاچا بہت جلد بول گئے ورنہ شاید محسن کو ان سے زیادہ ہی دفتروں کے چکر لگانے پڑے تھے امریکہ کے لئے وظیفے کی درخواستوں پر ابھی تک کوئی کارروائی نہیں ہوئی تھی۔ وہ روز وہاں جاتا ' سانولی ریپشن والی کو اپنے نام کی چٹ دیتا اور سامنے والی شیشہ سے چمکتی گول میز پر بیٹھ جاتا اور اس پر بکھرے ہوئے کتابچے بغور پڑھنا شروع کر دیتا۔ اس کی باتوں سے یہ پتہ چلتا تھا کہ ایک چھوڑ کئی افسروں سے وہ مل چکا ہے مگر باتیں کیا ہوتیں اس کا پتہ نہیں چل سکا۔ مگر اشرف چاچا کلیمز آفس کے کلرک تک بھی بس ایک ہی مرتبہ پہنچ سکے دوسرے دن انہیں چپراسی نے اندر جانے سے روک دیا۔ اس میں کچھ خطا خود اشرف چاچا کی بھی ہے جو اب تک کچہریوں کی فضا میں رہتے ہیں اور چپراسی کو اٹھنی سے زیادہ دینے کے روادار نہیں ہیں۔

کلیمز آفس کے چکر کاٹنے کا ایک فائدہ تو یقیناً ہوا کہ اشرف چاچا کو بسوں کا تجربہ اور سڑک سے کالونی کے اندر تک کے کچے رستے کی طوالت کا اندازہ ہو گیا۔ کالونی کے کوارٹروں کے متعلق بھی بہت کچھ معلوم ہوا۔ اشرف چاچا کی روایت یہ ہے کہ ٹھیکیدار نے سمنٹ میں آدھے راونت ریت ملایا ہے اس معاملہ میں دلی والی اشرف چاچا سے بھی زیادہ قنوطیت پسند نکلی۔ اس نے دیوار کو انگوٹھے سے بجا کر کہا" اے بی ' یہ ورقا سی دیواریں کے دن کھڑی رہیں گی" جب اس کالونی میں پہلی بارش ہوئی اور سیدانی جی کی دیوار ٹپکنے لگی تو انہوں نے بگڑ کر کہا" کمبختی ماروں نے چھت پائی ہے یا جھلی منڈھ دی ہے" اور پیلے کوارٹر والی اپنی پیلی رنگ والی چھت کو ٹپکتے دیکھ کر برملا یہ کہتی تھی کہ "خدا انہیں سمجھے کانپیں کھڑی کر کے پتنگیا کاغذ منڈھ دیا ہے"۔

اشرف چاچا کو اس سارے کھپلے کا بڑی شدت سے احساس تھا اس کے باوجود وہ اٹھنی سے نہیں بڑھے ہم پوچھتے "اشرف چاچا آپ کا کلیم داخل ہونے کا کوئی بیونت بنا"۔

اشرف چاچا جواب دیتے "بیٹا چوہے دان لگا رکھا ہے۔ آگے اللہ مالک ہے"

تماشے کی بات یہ ہے کہ اب ہمارے سب کے چوہے دان اشرف چاچا کا چوہے دان بن کر رہ گئے تھے' شروع میں تو ان میں بہت چوہے پھنسے لیکن اب عالم یہ تھا کہ کانٹے میں روٹی کا ٹکڑا لٹکا رہتا تھا' منہ اسی طرح کھلا ہوا' کانٹا اٹھا ہوا اور چوہوں کی گھروں میں وہی ریل پیل' انبالہ والی بولی میّا چوہے چالاک ہو گئے ہیں۔ اب چوہے دان میں نہیں آتے"

دلی والی نے ٹکڑا لگایا" اے بی بیوقوف تو ہم ہیں کہ جو الابلا ملی نگل لی۔ مجبور جو ہوئے' چوہوں کو کیا مجبوری ہے کہ مٹے لکڑی کے برادے کے لئے چوہے دان میں آئیں"۔

سیدانی جی کے جی کو یہ بات بہت لگی۔ انہوں نے دوڑ دھوپ کر کے گیہوں کے خالص آٹے کا انتظام کیا اور اس کی روٹی چوہے دان میں استعمال کی۔ مگر چوہے ایسے بد کے تھے کہ خالص آٹے کی روٹی پر بھی نہیں آئے۔ تب انہوں نے چند اور نئے تجربات کئے۔ مثلاً خالص آٹے میں توتیا کی ملاوٹ کی اور گولیاں بنا کر باورچی خانے میں جالی کے نیچے رکھ دیں۔ اس تجربے نے دو دن اپنا اثر دکھایا' تیسرے دن فیل ہو گیا۔ چوہے باورچی خانے کے ایک ایک گوشے کو ٹٹولتے اور جو ہری گیلی چیز پاتے کتر ڈالتے کھینچ کر لے جاتے اور توتیا ملی آٹے کی گولیاں اسی طرح رکھی رہتیں۔ سوکھتی رہتیں۔

محسن کی دانست میں چوہوں کو مارنے کے یہ بڑے دقیانوسی طریقے تھے۔ اس نے کتابچوں کے ذریعہ امریکہ کے زرعی نظام کے بارے میں جو نئی نئی معلومات حاصل کی تھی' اس کی روشنی میں اس نے اس مسئلہ پر غور کیا تھا اور ماں کو بتایا تھا کہ یہ چوہے تو کچھ بھی نہیں۔ شکاگو کی فارموں میں اتنا چوہا آیا تھا کہ وبائی صورت اختیار کر لی تھی۔ مگر وہاں کے تعلیم یافتہ کاشتکاروں نے بیریم کاربونیٹ سے دنوں میں ان کا قلع قمع کر دیا۔ سیدانی جی تو بیٹے کی بات سے متاثر نہ ہوئیں' مگر شہر سے واپسی میں بس میں اشرف چاچا سے یہ بات ہوئی تو وہ قایل ہو گئے۔ وہ بس سے اتر کے گھر گئے' گھر سے منور میڈیکل سٹور گئے۔ اب تو خیر یہ بہت بڑا میڈیکل سٹور ہے اور ڈاکٹر منور لمبی چمکیلی موٹر کار میں بیٹھ کر آتے ہیں۔ مگر ان دنوں یہاں گنتی کی دوائیوں کی شیشیاں اور پیکٹ رکھے رہتے تھے' باقی خانے خالی تھے انہوں نے اشرف چاچا کو بتایا کہ بیریم کاربونیٹ نہ صرف یہ کہ ان کے یہاں نہیں بلکہ شہر

کے کسی میڈیکل سٹور پر نہیں ملے گی کیونکہ اس کی امپورٹ کم ہوئی تھی اور مانگ یکایک بڑھ گئی مگر یہ کہ انھوں نے آرڈر دے رکھا ہے اور بلٹی عنقریب آنے والی ہے۔

اشرف چاچا نے جب اس نئے تریاق کا ذکر کیا تو ہم نے سمجھا کہ اشرف چاچا نے کوئی امریکہ دریافت کیا ہے ہمارے لئے یہ دریافت اور منور میڈیکل سٹور پر اس کے آنے کی خبر ایک بہت بڑا واقعہ تھی۔ بات یہ ہے کہ اب ہم سب کی حالت سیدانی جی کی سی تھی۔ چوہوں نے ہمیں بہت خراب کیا، کھانے پینے پہننے اوڑھنے اور برتنے کی کوئی چیز ان سے محفوظ نہیں تھی۔ دن میں ہر چیز اپنی جگہ پر قرینے سے نظر آتی۔ رات کو جانے کیا ہوتا کہ صبح ہونے پر چیز جو بہت تھی تھوڑی نظر آتی' جو تھوڑی تھی غائب ہوتی' جو باورچی خانے میں رکھی جاتی وہ سامان کے کمرے میں اور جو سامان کے کمرے میں ہوتی وہ لان میں پڑی دکھائی دیتی۔ صحیح وسالم چیزیں ادھر کتری اور پاک وصاف چیزیں ناپاک معلوم ہوتیں۔ چور رات کے پردے میں آتے اور صبح ہوتے ہوتے غائب ہو جاتے۔ بس نشانات باقی رہ جاتے' کہیں آٹے کے کنستر میں چند مینگنیاں' کوئی روٹی کتری ہوئی' کاغذوں کتابوں کی کسی الماری میں کترے ہوئے کاغذ بھسی کی چھوٹی سی ڈھیری کی صورت' پھر کبھی کبھی یوں ہوتا کہ ہم سوتے سوتے اچھل پڑتے کوئی بدبدی چیز لحاف پر گرتی۔ سرسراتی ہوئی زمین پر اتر جاتی اور چیخ چیخ کی سی آواز پیدا ہوتی' پھر خاموشی چھا جاتی اور ایک گجگجاہٹ کے احساس کے ساتھ ہم لحافوں میں دبکے پڑے رہتے۔ پھر کسی کمرے میں آواز پیدا ہوتی جیسے کسی نے چلغوزہ کڑکا۔ ایک چلغوزہ کڑکا جاتا' پھر دوسرا چلغوزہ کڑکا جاتا' پھر چلغوزے کڑکنے کا تار بندھ جاتا۔ پھر یوں لگتا کہ چلغوزے نہیں کڑکے جا رہے' دور کہیں کسی درخت کے تنے پر آہستہ آہستہ آری چل رہی ہے۔

رات کے پردے میں درخت کے تنے پہ آہستہ آہستہ آری چلتی رہتی اور رات لمبی ہوتی چلی جاتی صبح اٹھتے تو یاد کیے پہ بیتی رات ایک لمبا ڈراؤنا خواب معلوم ہوتی ہم دن کے کاموں میں لگ جاتے اور رفتہ رفتہ گذری رات آئی گئی بات ہو جاتی۔ مگر رات پھر آتی اور پھر درخت کے تنے پر دھیرے دھیرے آری چلتی پھر دن میں بھی آثار پیدا ہونے لگے۔

دیکھتے دیکھتے کالونی کے ہر کوارٹر کے لان میں بل بن گئے تھے۔ یکایک کسی بل میں دو بدرنگ لمبے بال سینگوں کی طرح اٹھے ہوئے اور دو آنکھیں چمکتی دکھائی دیتیں اور آن کی آن میں بل سے نکل کر وہ باورچی خانے میں داخل ہوتا اور اوجھل ہو جاتا۔ سیدانی بی آنگن میں رکھا ہوا لمبا بانس اٹھاتیں اور کبھی باورچی خانے میں کبھی سامان کے کمرے میں کبھی سونے بیٹھنے کے کمرے میں جاتیں اور ایک ایک صندوق پر پٹخاتیں۔ پھر سیدانی بی تھک گئیں۔ روٹی پکاتے پکاتے ان کی نظر نالی پہ پڑتی جہاں سینگوں ایسے دو بدرنگ بال اور شیشہ ایسی آنکھیں چمکتی نظر آتیں۔ اور وہ اسی طرح روٹی پکاتی رہتیں۔ پھر آس پاس رکھے ہوئے برتنوں میں سڑپڑ ہوتی اور جب سیدانی بی مڑ کر دیکھتیں تو روٹی ڈلیا سے نکل کر گھسٹتی گھسٹتی نالی کے پاس پہنچ چکی ہوتی۔ وہ بے دلی سے اٹھتیں اور روٹی اٹھا کر الگ مرغیوں کے لئے رکھ دیتیں۔ آنکھوں کے سامنے کبھی ایک کبھی دو کبھی ایک پوری لین ڈوری کمرے کمرے دوڑتی پھرتی رہتی اور وہ بیزار بیٹھی رہتیں۔ برآمدے میں بیٹھے بیٹھے ان کی نظر لان کے کسی بل پر پڑتی اور ایک لمبی سی دم باہر نکلی دکھائی دیتی۔ انہیں لگتا کہ گرگٹ کی دم ہے اور جسم میں جھرجھری دوڑ جاتی اور اپنی جگہ پر جمی کی جمی رہ جاتیں کوارٹر انہیں میلا میلا اور برتن بھانڈے نجس نظر آتے' دیگچیوں' رکابیوں اور پیالوں کو وہ راکھ سے خوب مانجھتیں' پانی کے تریڑے دیتیں' تین تین دفعہ پاک کرتیں اور پھر بے اطمینانی رہتی۔ کمروں کے فرش کو جمعہ کے جمعہ دھوتیں۔ بالٹیاں کی بالٹیاں پانی کی بہاتیں اور اس کے باوجود اب وہ گھر کے کچے فرش پر ننگے پیر نہیں پھرتی تھیں۔ سیدانی بی پر موقوف نہیں ہم سب کی یہی حالت ہو گئی تھی۔ مولوی عثمان علی نے جو ان دنوں کلام پاک اور انجیل اور قصص الانبیاء کے حوالے سے پرانی امتوں کے قصے بہت سناتے تھے آل فرعون کے عذاب کا قصہ سنایا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے فرعون سے کہا کہ دیکھ میں تیرے ملک کی سب اطراف کو مینڈکوں سے بھردوں گا۔ اور دریا بے شمار مینڈک پیدا کرے گا' اور وہ اوپر آ کے تیرے گھر میں اور تیری آرام گاہ میں اور تیرے پلنگ پر اور تیرے ملازموں کے گھروں میں اور تیری رعیت پر اور تیری تنوروں میں اور تیرے آٹا گوندھنے کے لگنوں میں داخل ہوں گے اور مینڈک تجھ پر اور تیری رعیت پر

اور تیرے سب نوکروں پر چڑھیں گے۔ یہ قصہ سن کر ہمیں عجب گجگجاہٹ کا احساس ہوا۔ بعد میں یہ گجگجاہٹ ہمارے احساس کا حصہ بن گئی۔ ہمارے حواس میں رس بس گئی۔ اجاڑ زمینوں کے، اور عذاب سے تباہ شہروں کے گرد سے اٹے رخنے اور نجاست سے بھرے سوراخ کھل گئے تھے اور چوہے نکل نکل کر ہمارے گھروں میں ہماری آرامگاہوں میں، ہمارے بستروں میں، ہمارے چولہوں اور تنوروں اور آٹا گوندھنے کے لگنوں میں داخل ہو رہے تھے ہم پر گجگجاہٹ طاری تھی۔

سیدانی جی کو اکثر امریکہ والے پر اور کبھی کبھی محسن پر غصہ آتا۔ روز پانچوں وقت کی نماز کے بعد وہ محسن کے امریکہ جانے اور اپنے کربلائے معلی جانے کی دعا کرتیں۔ روز ہم منور میڈیکل سٹور پر بیریم کاربونیٹ کی بلٹی کا پتہ لینے جاتے۔ روز ہمیں ناکام واپس ہوتے دیکھ کر مولوی عثمان علی مایوسانانہ انداز میں سر کو جنبش دیتے اور خبردار کرتے کہ جب تک مسلمان اپنے اعمال کی اصلاح نہیں کریں گے۔ بیریم کاربونیٹ سے کوئی نتیجہ نہیں نکلے گا۔ پھر وہ واعظانہ لہجہ میں قصے سناتے ان امتوں کے جن کی کھیتیاں ٹڈیاں چاٹ گئیں، ان شہروں کے جنہیں سیلابوں نے آلیا۔ ان بستیوں کے جن کے باسی جون بدل کر آدمی سے بندر بن گئے۔ روز ہم وہی قصے سنتے اور وہی باتیں کرتے ان قصوں اور باتوں سے ہم بیزار ہو جاتے اور پھر وہی قصے سنتے اور وہی باتیں کرتے دنوں کا فرق ختم ہو گیا۔ ہر نیا دن وہی پرانا دن اور ہر صبح وہی پچھلی صبح ہوتی۔ دنوں کے رنگ اور راتوں کی رنگا رنگی جاتی رہی لگتا کہ زمین کیلی پر گھومتے گھومتے رک گئی ہے اور سب کچھ ٹھہر گیا ہے۔ سب کچھ ٹھہر گیا تھا، بیریم کاربونیٹ کا گیا ہوا آرڈر، بجلی کا آیا ہوا سلسلہ، پکی بنتی ہوئی سڑک، اور خود ہم، ہمارے احساسات اور رد عمل بجلی ہماری کالونی میں اب آگئی تھی اور بڑی سڑک پکی بن گئی تھی، مگر جو رستے کچے رہ گئے تھے اور جو کوارٹر ادھ بنے کھڑے تھے اور جہاں بجلی کے کھمبے تاروں اور چینی کی گٹکوں کی آرائش سے محروم کھڑے تھے وہ لگتا تھا کہ کالونی کی تعمیر کے نقشے کا حصہ ہیں کہ اب انکی صورت یہی رہے گی۔ حرکت کو تصور میں لانے کے لئے ہم اپنی کالونی سے پرے اس شیشہ ایسی چمکتی کالی سایہ دار سڑک کو دیکھتے جہاں تھوڑے تھوڑے

وقفے کے بعد بس شور کرتی ہوئی گزرتی، اسے رکتے اور گھرائے کے ساتھ چلتے دیکھتے تو
جانتے کہ دور بلندی پر کوئی الگ دنیا ہے جہاں ہر چیز روشن اور رواں دواں ہے، اور کبھی
کبھی عجب خیال آتا کہ اشرف چاچا کلیمز کے دفتر کا چکر لگانے کے بعد واپس آئیں گے تو
ہماری بدلی ہوئی صورتیں دیکھ کر، ہمارے چیاں ایسی آنکھیں اور منہ پر سینگوں کی طرح اٹھے
ہوئے بدرنگ بال دیکھ کر ششدر رہ جائیں گے، اور ہراساں وپریشاں واپس ہو کر پھر بس
میں سوار ہو جائیں گے۔ اور پھر ہم سوچتے کہ کیا چکرا الٹا بھی چل سکتا ہے کہ آدمی مکانوں
کو چھوڑ کر درختوں پر بسیرا کرنے لگے اور درختوں سے اتر کر بلوں اور سوراخوں میں رہنے
لگے۔ ہمارے سوچنے کی بھی ایک ڈگر مقرر ہو گئی تھی، ہر پھر کر وہی باتیں سوچتے تھے اور
وہی کیفیتیں محسوس کرتے تھے۔ بس ذہن کے اندر ایک دائرہ سا بن گیا تھا اور خیالات کی
چکی سی چلتی رہتی تھی، اب تو رات اور دن بھی سیاہی اور سفیدی کا دائرہ تھے۔ رات
ابتداء ہوتی تو ختم ہونے میں نہ آتی اور دور درخت کے تنے پر آری لگاتار دھیرے دھیرے
چلتی رہتی، اور پھر آس پاس کبھی پلنگ کے نیچے کبھی لحاف کے اوپر کوئی بد بدی سی چیز
سرسراتی اور آنا" فانا" گم ہو جاتی اور ہم پر یہ گجگاہٹ طاری ہوتی کہ دم رکنے لگتا۔
بدرنگ گجگجی رات رینگتی رہتی رینگتی رہتی، اور آخر پھیکی پڑنے لگتی اور آسمان پر اجالے کی
لکیر دم کی طرح رینگتی ہوئی پھیلتی، خدا خدا کر کے دن نکلتا اور ہم اپنے بلوں سے نکلتے اور
انہیں روز مرہ کے رستوں پر رینگنے لگتے۔ پکی سڑک اب پکی نہیں لگتی تھی، اور کچے رستے
زیادہ کچے دکھائی دیتے تھے اور کیا پکی سڑک اور کیا کچے رستے ہر روش خاک اڑتی رہتی اور
ہمارے کوارٹر جو برسات سے پہلے تک اجلے اجلے تھے اب مٹیالے مٹیالے نظر آتے اور لگتا
کہ آہستہ آہستہ بیٹھتے جا رہے ہیں کہ کسی رات وہ نیچے دھنس جائیں گے اور صبح کو ہم پنجوں
کے بل سکڑ کر روشندانوں کی راہ رینگتے ہوئے نکلیں گے۔

خیالات کے اس رینگتے دائرے کو بیریم کاربونیٹ نے توڑا۔ بیریم کاربونیٹ سچ مچ آ گئی۔
جب یہ خبر ملی ہے کہ بیریم کاربونیٹ کی بلٹی آ گئی ہے تو کچھ نہ پوچھو کہ کیا حال ہوا ہے۔
ایسا لگتا تھا کہ کیلی پر ٹھہری ہوئی زمین پھر یکایک گھومنے لگی ہے جس کو ارڑوالے کو دیکھو

منور میڈیکل سٹور کی طرف چلا جاتا ہے جب ہم وہاں پہنچے ہیں تو ایک مجمع جمع تھا اور ڈاکٹر منور کہہ رہے تھے "بیریم کاربونیٹ ختم ہو گئی"۔

ہم نے اشرف چاچا سے کہا "اشرف چاچا بیریم کاربونیٹ بھی بلیک میں چلی گئی"۔

اشرف چاچا غصے میں بھرے مجمع کو چیرتے ہوئے سٹور میں داخل ہوئے۔ ترخ کر بولے کہ "ایک دن میں ختم ہو گئی آج بلٹی آئی ہے' آج ہی ختم ہو گئی"۔

ڈاکٹر منور نے سکون سے جوابدیا "بات یہ ہے کہ رام گڑھ کے زمینداروں نے لمبے آرڈر بک کرا رکھے تھے"۔

"رام گڑھ کے زمینداروں نے" اشرف چاچا اسی غصے سے بولے "آپ نے میڈیکل سٹور کالونی والوں کے لئے قائم کیا ہے یا رام گڑھ کے زمینداروں کے لئے مصیبت ہم پر آئی ہوئی ہے' بیریم کاربونیٹ رام گڑھ کے زمیندار لے گئے"۔

"اشرف چاچا۔ وہاں زیادہ مصیبت آئی ہوئی ہے"

"کیا مصیبت آئی ہوئی ہے"۔

"رام گڑھ کے کھیتوں میں چوہا آگیا ہے"

"رام گڑھ کے کھیتوں میں ..... میں ..... چوہا ......" اشرف چاچا کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

ڈاکٹر منور اطمینان سے کرسی پر بیٹھا اور فاؤنٹین پن نکال کر لکھنا شروع کر دیا۔ اشرف چاچا سٹپٹائے سے کھڑے رہے' پھر دکان سے نیچے اترے اور کھوئے کھوئے سے چلنے لگے دیکھتے دیکھتے مجمع چھنٹ گیا اور منور میڈیکل سٹور کے سامنے کی سڑک بالکل خاموش ہو گئی۔

اشرف چاچا منور میڈیکل سٹور سے نوا کی دوکان پہ پہنچے۔ وہاں یہ خبر پہلے ہی پہنچ چکی تھی۔ مولوی عثمان علی خاموش حقہ پی رہے تھے۔ نوا انہیں تک رہا تھا۔ اشرف چاچا بھی مونڈھا گھسیٹ کر خاموش بیٹھ گئے۔

نوا بولا "اشرف چاچا میرا تو کل ہی ماتھا ٹھنک گیا تھا۔ جب رام گڑھ سے گھی والا آیا تو کہنے لگا کہ تم شہر والوں نے ہمیں بھی بیماری لگا دی"۔

نصرو ٹین ساز جو اشرف چاچا کو سنجیدگی سے چلتے دیکھ کر ساتھ لگ لیا تھا، بولا "کہتے ہیں جی کہ بہت چوہا آیا ہے"۔

اشرف چاچا نے کوئی جواب نہیں دیا۔

مولوی عثمان علی نے حقے کی نے کو ایک طرف کیا۔ بولے "اللہ مسلمانوں پر رحم کرے" چپ ہو گئے۔ آنکھیں پھاڑے کچھ سوچتے رہے پھر فرمایا "جب آدمی کے حصے کا رزق دوسری مخلوق کھا جائے تو سمجھنا چاہئے کہ عذاب آگیا"۔

اشرف چاچا اس پر بھی کچھ نہیں بولے۔ مولوی عثمان علی چپ بیٹھے رہے، زمین کو تکتے رہے پھر اٹھ کھڑے ہوئے "اللہ رحم کرے" اور اپنے گھر کو ہو لئے۔

واقعہ یہ ہے کہ اس وقت ہم میں سے کوئی بھی تو کچھ بات نہیں کر سکا بس گم سم بیٹھے رہے۔ پھر ایک ایک کر کے گھر چلے گئے۔ وہ رات بھی بھاری گذری۔ سیدانی جی کہتی ہیں کہ رات بھر ایسی آواز آتی رہی۔ جیسے پانی کی بھری مشک کوئی کتر رہا ہے۔

دوسرے دن جب ہم جاگے تو سیدانی جی کو چلاتے سنا کہ "کمبخت ننوا کے طاعون کی گلٹی نکلے۔ بے ایمانی پہ کمر باندھ رکھی ہے۔ آخر کل بھی تو میں نے اسی کے سے اڑد کی دال منگائی تھی مٹے نے ایک دن میں اگنے سے دوگنا بھاؤ کر دیا"۔

سیدانی جی کے احتجاج کے باوجود اڑد کی دال اور اڑد کی دال کے ساتھ دوسری دالیں اور دالوں کے ساتھ دوسری چیزیں مہنگی ہوتی چلی گئیں۔ اور سیدانی جی نے اعلان کر دیا کہ "نابھیا میں تیرے امریکہ والے کا کب تک انتظار کروں۔ میں اب یاں نہیں رہوں گی"۔

اس اعلان کے باوجود سیدانی جی ابھی تک کربلائے معلی نہیں جا سکی ہیں اور محسن جیسے چوہے دان میں کوئی چوہیا پھنس گئی ہو اور نکلنے کے لئے بیقرار ہو روز کالونی سے شہر جاتا ہے اور انٹرویو دیتا ہے مگر ابھی تک وظیفے کی صورت پیدا نہیں ہوئی ہے۔

(۱۹۵۸ء)

❁ = = = = = = = = ❁

سمجھوتا

یہ خبر آگ کی طرح پھیلی کہ چھموں آپا کی لونڈیا لاہور کے بڑے شفاخانے میں دائی ہو گئی ہے۔ رقیہ خالہ اور اختری نے اس پر بہت کوس کٹائی کی لیکن جو خبر ایک دفعہ نکل گئی ہو کہیں دبا کرتی ہے۔ رقیہ خالہ نے تو خیر آخر دم تک اس امکان سے انکار کیا کہ ان کے خاندان کی کوئی لڑکی نوکری بھی کر سکتی ہے۔ مگر اختری نے واقعات و شواہد کو پے در پے اپنے خلاف جاتا دیکھ کر اپنے موقف کو کسی قدر بدل لیا اور یہ کہا کہ "بی بی کہنے والیوں کا کیا ہے وائی کہہ دیں۔ مگر ہماری لونڈیا تو ڈاکٹرنی بنی ہے۔ آلہ گلے میں ڈال کے شفاخانے جاوے ہے اور اللہ نظربد سے بچاوے اگلے برس تک سول سرجن ہو جاوے گی"۔

ننھی چچی نے جب یہ سنا تو بولیں کہ "اری ہم کوئی کسی کا براچاویں ہیں۔ اللہ کرے ڈاکٹرنی ہی بنے۔ مگر میں نے تو اسی کی بات زبان سے دہرائی تھی' اپنے دماغ سے تھوڑا ہی اتاری ہے"۔

ننھی چچی کا یہ بیان درست تھا' انہوں نے اپنی اطلاع خود نزہت سے حاصل کی تھی' یہ الگ بات ہے کہ وہ ان کے روز مرہ اور لہجہ میں ڈھل کر کسی قدر بدل گئی تھی۔ وہ پچھلے دنوں لاہور گئیں تو داتا صاحب جاتے ہوئے جب بس گنگارام ہسپتال پہ رکی تو لڑکیوں کے ایک چڑھتے ہوئے سیلاب میں نزہت کو انہوں نے فوراً شناخت کر لیا" اری تو چھموں کی لونڈیا ہے نا؟"

نزہت نے کسی قدر سٹپٹا کر چچی کو دیکھا' پھر فوراً آداب بجا لائی "ننھی چچی آداب"۔

"جیتی رہ بیٹی!" دعا دیتے دیتے ننھی چچی نے اوپر سے نیچے تک کا جائزہ لیا اور بولیں "ماشاء اللہ سیانی ہو گئی ہے۔ میری تو پہچان میں نہ آئی"۔ پھر انہوں نے کئی بار آنکھیں مچکا کر سینے کے درمیان سجے ہوئے پٹی جیسے دوپٹے کو دیکھا اور بولیں "بیٹی گلے میں پٹی ڈالنے کا یہ کوئی نیا فیشن ہے؟"

نزہت نے اس بے تکلفانہ تبصرے کو بظاہر بالکل نظر انداز کر دیا اور سادگی سے کہا "چچی یہ دوپٹہ ہے"۔

"دوپٹہ ؟" ننھی چچی کسی قدر حیران ہو کر بولیں "بیٹی دوپٹہ تو سینے اور سر پہ اوڑھا جاوے ہے"۔

اس سرسری ملاقات میں نزہت نے انہیں یہ اطلاع دی تھی کہ وہ نرسنگ کا کورس کر رہی ہے۔ ننھی چچی نے نرس کو بے تکلف اپنی زبان میں ترجمہ کر کے دائی بنا لیا اور بیبیوں میں بیٹھ کر سخت حیرت کا اظہار کیا" بی بی ہمارے زمانے میں تو دائیاں ملی ولی رہوے تھیں۔ مگر لاہور میں تو قیامت ٹوٹ رہی ہے۔ شریفوں کی بیٹیاں دائی بن رہی ہیں اور تیتریوں کی طرح یوں اڑی اڑی پھرے ہیں"۔ لاہور کی عمومی اخلاقی حالت پر تبصرہ کرتے کرتے انہوں نے جھموں آپا کی بیٹی کا ذکر چھیڑا" اللہ توبہ بڑی اچھال چھکا ہے۔ اتی سی لونڈیا قمیض شلوار میں پھنی پڑے ہے اور قمیض وہ کا ہے کو تھی حرافہ نے جھلی بدن پہ منڈھ رکھی تھی"۔

ننھی چچی کے ہونٹوں سے نکلی کوٹھوں چڑھی بات گھر گھر پھیل گئی۔ کہنے والیوں نے رقیہ خالہ اور اختری کے منہ پر بھی کہا۔ رقیہ خالہ بہت بگڑیں "بیبیو! جوان لڑکیاں سب کے آگے ہیں کسی کی بیٹی کو یوں بدنام نہیں کیا کرتے"۔

لیکن ہر بی بی نے اپنی صفائی پیش کر دی اور آخر میں یہ بات کھلی کہ یہ سب آگ ننھی چچی کی لگائی ہوئی ہے۔ اختری نے فوراً جوابی حملہ کیا وہ بھی تو لاہور رہ کر آئی تھی" یہ آفت کی پڑیا بڑھیا اپنی نواسیوں کی ذرا خبر لے۔ کالج میں انہوں نے کیا آفت بو رکھی ہے

- ہر لونڈے سے رقعے پرچے کرتی پھریں ہیں"۔

مگر چھموں آپا کی بیٹی کی بات اس وقت اتنی گرم تھی کہ جوابی حملہ زیادہ کارگر نہ ہو سکا - رقیہ خالہ اور اختری دونوں نے ننھی چچی سے حصہ بخرا بند کر دیا یہاں تک کہ پوتا ہونے کی مبارکباد دینے بھی نہیں گئیں - چھموں آپا کو فوراً بذریعہ خط سارے حالات سے مطلع کیا گیا چھموں آپا کا جواب بھی آ گیا - مگر ان کا خط عجب طرح کا تھا کہ ننھی چچی کی اطلاعات کی اس سے نہ تو تائید ہوتی تھی اور نہ تردید ہوتی تھی۔

رقیہ خالہ اگلے ہی مہینے بہن سے ملنے لاہور گئیں بھانجی کے بارے میں یہ خبر تو بہرحال غلط نکلی کہ وہ وائی بن گئی ہے مگر اس کی چنک منک دیکھ کر وہ بھی وسوسے میں پڑ گئیں - لاہور سے واپسی پر انہوں نے ننھی چچی کے بیانات کی تردید ضرور کی مگر اب ان کے لہجہ میں وہ پہلے والا اعتماد نہیں رہا تھا - بلکہ اختری سے تو انہوں نے خفیہ خفیہ صاف کہہ دیا کہ "چھموں آپا کسی دن سر پکڑ کے رو دیں گی - لڑکی کے لچھن اچھے نہیں ہیں"۔

واقعہ یوں ہے کہ رقیہ خالہ نئے طور طریقوں کو کسی صورت برداشت نہیں کرتی تھیں - جب ان کے گلو نے پہلی بار تنگ پتلون پہنا تھا تو انہوں نے صاف نوٹس دیدیا کہ "حرام کے جنے پھر میں نے تجھے یہ بندوق کی کرتی پہنے دیکھی تو ٹانگیں توڑ دوں گی" اور گلو نے مہینے بھر تک واقعی اس پتلون کو نہیں پہنا۔ گلو نے نئی زندگی کا آغاز کوکا کولا سے کیا تھا۔ اس نے یہ نسخہ بڑے جتن سے معلوم کیا تھا کہ کوکا کولا میں اگر اسپرو کی دو گولیاں گھول لی جائیں تو وہ شراب بن جاتی ہے۔ کوکا کولا کی پہلی بوتل اس نے اسی نسخہ کے ساتھ پی تھی اور اسے واقعی یوں لگا کہ اس نے شراب پی ہے - لیکن رفتہ رفتہ اسپرو کی گولیوں کے گھولنے کے باوجود کوکا کولا کا نشہ غائب ہو گیا۔ بس اب اسے ایک عادت سی ہو گئی تھی کہ چار قدم چل کر کسی دکان پر رکا، کوکا کولا کی بوتل لے کر منہ سے لگائی اور غٹاغٹ پی ڈالی اور گہرے سرخ رنگ کے چار خانے والی قمیض چست پتلون کے ساتھ وہ بیٹھک میں چھپ کر پہنتا اور چپکے سے باہر نکل جاتا۔ کسی کسی دن رقیہ خالہ دیکھ لیتیں تو گھر کے برتن باہر پھوڑتیں - مگر رفتہ رفتہ ٹانگیں توڑنے کی دھمکی ڈھیلی پڑ گئی اور رقیہ خالہ نے یہ سوچ کر صبر

کر لیا کہ لڑکوں کا کیا ہے آوارہ بھی ہو جائیں تو کچھ نہیں بگڑتا ۔ نازک معاملہ تو لڑکی کا ہوتا ہے۔

اور رقیہ خالہ کی لڑکی بھی اب ماشاء اللہ بڑی ہو چلی تھی سیانی ہوتی ہوئی لڑکی کا عالم عجب ہوتا ہے۔ آج جو کپڑے ڈھیلے ہیں وہ مہینوں کے اندر اندر جسم پر پھٹنے لگتے ہیں۔ کم ازکم رقیہ خالہ نے فرد کی دن دن تنگ ہوتی قمیض کی شروع میں یہی توجیہہ کی تھی۔ مگر فرد کا جسم بڑھ رہا تھا اور قمیص کا گھیر کم ہوتا چلا جارہا تھا اور جب سے وہ رقیہ خالہ کے ساتھ لاہور کا چکر لگا کر آئی تھی تو نزہت آپا اسے بار بار یاد آتی تھیں اور اب اس کی قمیص کا پہلو والا نیچے کا بیچ کا بٹن کھلا رہنے لگا تھا۔ رقیہ خالہ نے اس بے شرمی پر اسے کئی بار ٹوکا بھی تھا اور ہر بار اس نے سٹپٹا کر بند کر دیا تھا۔ مگر پھر ایسا ہوا کہ پہلو میں بیچ کے بٹنوں کی گنتی بڑھتی چلی گئی اور ایک کی جگہ دو بٹن کھلے رہنے لگے ۔ بیچ کے دو بٹن ہر دم کھلے رہتے اور اجلا اجلا پنڈا مستقل جھلکتا رہتا اور اپنے بھرے بھرے پچھائے کے ساتھ فرد ایسی لگتی جیسے بالکل جوان ہو گئی ہے۔

میٹرک کا امتحان ختم ہو چکا تھا۔ اور اب فرد کی چھٹیاں شروع تھیں اور اسے اس قصباتی فضا میں سخت بوریت ہو رہی تھی اور رقیہ خالہ کو یہ فکر کھائے جا رہی تھی کہ لڑکی پڑھ لکھ کے بڑی ہو گئی ۔ اب اسے گھر میں کب تک بٹھایا جائے ۔ جب وہ اس مسئلہ پر سوچنا شروع کرتیں تو سوچتی ہی چلی جاتیں اور رات گئے تک جاگتی رہتیں۔

بور ہوتے ہوتے فرد پر نزہت آپا سے ملنے کا دورا پھر پڑا۔ اور رقیہ خالہ نے سوچا کہ لڑکی کا جی اور سا ہو جائے گا ۔ چھٹیوں میں خالہ کے پاس چلی جائے تو کیا مضائقہ ہے۔

میٹرک کا نتیجہ اس وقت آیا جب فرد لاہور میں تھی اور نزہت نے خالہ جان کو ایک خط میں نرسنگ کورس کی تفصیلات اور فائدے لکھے۔ رقیہ خالہ پہلے اس خط پر برہم ہوئیں "دیکھو اس لونڈیا کو جیسی خود حرافہ ہے ویسی ہی میری لونڈیا کو بنانا چاوے ہے"۔ مگر پھر برہمی تو ختم ہو گئی اور وہ سوچ میں پڑ گئیں اور پھر انہوں نے ٹھنڈا سانس بھر کے اختری سے کہا کہ "بھئی بڑے بڑے لوگ اپنی بیٹیوں کو نوکریاں کرا رہے ہیں۔ ہماری کیا اوقات

ہے"۔

اور فرد جب عید کی چھٹیوں میں گھر آئی تو اس کی قمیض کا گھیر نزہت کی قمیض کے گھیرے سے بھی چھوٹا تھا اور سر کے بال کنپٹی تک رہ گئے تھے۔ رقیہ خالہ کو یہ بات اچھی نہیں لگی مگر ساتھ ہی انہیں یہ بھی محسوس ہوا کہ ان کے سر پہ بیٹی کا جو منوں بوجھ رکھا ہوا تھا وہ اتر گیا ہے۔

(۱۹۶۴ء)

= = = = = = =

آخری خندق

اس روز بھی کوئی ایسی نئی بات تو نہیں ہوئی تھی۔ پیشکار صاحب روز کی طرح اس روز بھی گزرتے گزرتے مرزا صاحب کے کوارٹر کے سامنے کھڑے ہو گئے مگر کوئی ایسی لمبی چوڑی بات تو نہیں ہوئی تھی۔ لمبی چوڑی باتیں تو جنگ کے دنوں میں ہوا کرتی تھیں۔ پیشکار صاحب گزرتے گزرتے مرزا صاحب کے کوارٹر کے سامنے ٹھٹھکتے اور کہنے لگتے۔

"مرزا صاحب رات تو بہت توپ چلی ہے"۔

مرزا صاحب حقہ پیتے پیتے حقہ کی نے الگ کرتے اور کہتے: "میرے خیال میں تو رات بھر چلی ہے۔ میں بارہ بجے کے بعد سویا ہوں مگر آنکھ لگی تھی کہ پھر کھل گئی۔ پہلے تو میں یہ سمجھا کہ زلزلہ آگیا ہے"۔

"ہاں صاحب کچھ لمبا ہی کام ہوا ہے رات"۔

"میرا خیال یہ ہے پیشکار صاحب کہ اپنے شیر امرتسر پہنچ گئے"۔

"اماں نہیں"۔

"مت مانو جی۔ آجائے گی کل تک خبر۔ خود پتہ چل جائے گا"۔

یوں ان روزوں بھی پیشکار صاحب مرزا صاحب کی رایوں سے کچھ بہت زیادہ اتفاق نہیں کرتے تھے۔ مگر اس کے باوجود آپس میں مفاہمت تھی۔ کشیدگی تو اس کے بعد شروع ہوئی ہے اور عجب طرح سے شروع ہوئی۔ مگر خیر ذکر تو اس روز کا ہے۔ اس روز تو پیشکار

صاحب نے کوئی ایسی بات نہیں کہی تھی - بات تو بس ایک ہی کہی تھی جو روز رستہ چلتے چلتے کہا کرتے تھے اور رستہ چلنے کا پیشکار صاحب کا اپنا ایک طریقہ ہے۔ بات یہ ہے کہ پیشکار صاحب اب خاصے عرصے سے ریٹائر چلے آتے ہیں - مگر وہ جو صبح صبح گھر سے تیار ہو کر نکلنے کی عادت تھی وہ قائم ہے - اب وہ کچہری نہیں جاتے تو ڈاکٹر صاحب کی دکان پر جاتے ہیں اور جب تک دوپہر نہیں ہو جاتی اور ڈاکٹر صاحب دکان سے اٹھنے نہیں لگتے وہ وہاں مستقل ڈٹے بیٹھے رہتے ہیں اور مرض کے بہانے اور بے بہانے آنے والوں سے سیاست پر گفتگو کرتے رہتے ہیں - خیر بیٹھ کر ہی گفتگو کریں - مگر انہیں تو باتیں کرنے کا ایسا لپکا ہے کہ چلتے چلتے کسی بھی نکڑ پر کھڑے ہو جاتے اور کسی کو روک کر باتیں کرنے لگتے ہیں - تو کبھی اس نکڑ پہ کھڑے ہو جانا کبھی اس نکڑ پر ٹھٹھک جانا۔ کبھی اس سے بات کرنا کبھی اس سے بات کرنا۔ رستے میں مرزا صاحب کا کوارٹر بھی آتا تھا۔ تو مرزا صاحب کو برآمدے سے باہر حالطہ میں بیٹھا دیکھ ان سے بھی ڈیڑھ بات کر لیا کرتے تھے اور اس روز بھی ڈیڑھ ہی بات ہوئی تھی۔ رہا خندق پر اعتراض تو خندق پر تو پیشکار صاحب کو اعتراض اسی روز سے چلا آرہا تھا جس روز سے انہوں نے اپنی خندق پٹوائی تھی - خندقیں اس کالونی میں اچھی خاصی تعداد میں کھدی تھیں - اور ایک خندق تو خود پیشکار صاحب ہی کی تجویز پر کوارٹروں کے سامنے والے اس میدان میں بھی کھدی تھی جہاں لڑکے بارھوں مہینے کرکٹ کھیلتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ جنگ کے بعد یہی خندق سب سے پہلے زد میں آگئی۔ فائر بندی کے تیسرے دن لالو مہترانی اپنا ٹوکرا اس خندق میں الٹ گئی۔ پیشکار صاحب نے گزرتے گزرتے جب خندق کو یوں خراب دیکھا تو انہوں نے بہت شور مچایا۔ لالو مہترانی اس دن تو دبل گئی تھی بلکہ ہفتہ ڈیڑھ ہفتہ دبلی ہوئی رہی - مگر اس کے بعد اس نے الکساہٹ میں دور جانے کی بجائے پھر وہاں اپنا ٹوکرا الٹ دیا۔ اس بار کسی نے اس پر توجہ نہ کی - اس نے دوسرے دن بھی اپنا ٹوکرا وہیں الٹا اور دوسرے دن بھی کسی نے دھیان نہیں دیا۔ اور اب تو دھیان دینے کا کوئی فائدہ ہی نہیں۔ خندق کوڑے کرکٹ سے لبالب بھر چکی ہے بلکہ اب تو اونچی ہو گئی ہے - آس پاس کے کوارٹروں کی مرغیاں ہر پھر کر اس مقام بلند پر

آتی ہیں - کبھی کبھی کوئی مرغا گردن پھلا کر کچکچا کر کسی مرغی پر سوار ہو جاتا ہے پھر اپنے پھیلے ہوئے پنجوں سے زور زور سے کوڑے کو کریدتا ہے اور بازو پھنپھنا کر بہت زور سے بانگ دیتا ہے - مرغیوں کے پر یہاں خاصے ہی بکھرے پڑے ہیں اور ایک دن تو یہاں ایک مری ہوئی بلی بھی پڑی ہوئی تھی - خیر وہ تو دوسرے ہی دن کوڑے کی گاڑی آنے پر اٹھ گئی تھی مگر جنگ کے دنوں میں یہ خندق کتنی صاف ستھری تھی-

ویسے دوسری خندقوں کی یہ صورت نہیں ہوئی- دوسری خندقیں تھیں بھی تو کوارٹروں کے اندر - یہ سب کورٹر ایک جیسے ہیں - آگے مختصر سا برآمدہ- برآمدہ کے آگے مختصر سالان - لان کے آگے پست دیوار جنگ کے دنوں میں ہر برآمدے کے آگے ایک خندق کھد گئی تھی اور جنگ کے دنوں میں یہ خندقیں کتنی صاف ستھری تھیں اور تازہ کھدی ہوئی مٹی سے کیسی سوندھی سوندھی خوشبو نکلتی تھی- اب یہ سوندھی سوندھی خوشبو کہاں- اب تو انہیں دیکھ کر یوں لگتا ہے کہ صدیوں پہلے یہاں کوئی جنگ ہوئی تھی اور خندقیں کھدی تھیں - اب خندقیں نہیں ہیں- خندقوں کے آثار ہیں - سوکھے زرد پتے' پھٹی ٹوٹی چنگیں' کبوتروں کے باسی پر' سرکنڈوں کے چھوٹے بڑے ٹکڑے' کوئی ٹوٹی پھوٹی شیشے کی بوتل' کوئی زنگ آلود ٹین کا ڈبہ' کوئی پچکی ہوئی سگریٹ کی ڈبی' کوئی تڑا مڑا لیڈی شو' کوئی مٹی میں رلا ملا لیر لیر دوپٹہ' کوئی صحیح وسلامت انڈرویئر- سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ انمل بے جوڑ چیزیں خندقوں میں کن کن راستوں سے پہنچیں اور اب ہر خندق آثار قدیمہ کی روایت کا حصہ نظر آتی ہے - پیلی کوٹھی والوں نے اچھا کیا کہ فائر بندی ہوتے ہی اپنی خندق پٹوا دی- یوں تو اس کالونی میں کوارٹر ہی کوارٹر ہیں مگر اکا دکا کوٹھی بھی ہے ہی اور پیلی کوٹھی والے تو بہت معزز لوگ ہیں - ان کے دونوں بیٹے بڑے عہدوں پر فائز ہیں - تیسرا بیٹا وظیفہ پر امریکہ گیا ہوا ہے - فائر بندی کے دوسرے ہی دن انہوں نے ڈرائیور سے کہا کہ کار کو اب دھلوا لو اور مالی کو بلوا کر کہا کہ لان بہت برا لگ رہا ہے خندق کو پاٹ دو - مگر ذکر تو مرزا صاحب کی خندق کا تھا جیسے وہ پٹوانے کے لئے تیار نہیں تھے- دوبارہ جنگ کے جو منتظر تھے خود پیشکار صاحب ہی اپنی خندق کب پٹوا رہے تھے- بس اچانک ہی ان پر جھلاہٹ سوار ہو

گئی- ہوا کیا کہ ایک روز صبح صبح جب وہ گھر سے نکلنے لگے تو برآمدے میں تھے کہ انہیں خندق سے کچھ کھسر پھسر کی کچھ سانسوں کی آواز سنائی دی- وہ متجسس ' خندق کی طرف بڑھے- اتنے میں کیا دیکھتے ہیں کہ دو لڑکے اچک کر خندق سے نکلے اور تیر ہو گئے- پیچھے رہ جانے والے گورے چٹے لڑکے کا پاجامہ تھوڑا کھسک چلا تھا اور کمر بند زمین میں گھسٹتا چلا جا رہا تھا- اس نے سڑک کے بیچ رک کر پاجامہ کو اوپر اکسایا' کمر بند کو نیفے میں ٹھونسا اور پھر ایسا تیز دوڑا کہ دیکھتے دیکھتے آنکھوں سے اوجھل ہو گیا- شاید اس روز ڈاکٹر صاحب کی دکان پر کسی جگی مریض سے جو خود کو سیاسی امراض کی تشخیص میں ماہر جانتا تھا پیشکار صاحب نے سیکنڈ راؤنڈ پر لمبی ہی بحث کر ڈالی- جب دوپہر کو واپس ہوئے تو تھوڑے سے جھلائے ہوئے تھے- انہوں نے برامنہ بنا کر نذیر کو آواز دی: "ابے نذیرا- یہ خندق آج پٹے گی- حرامزادوں نے خندق کو بدمعاشی کا اڈا بنا رکھا ہے"- برآمدے میں جاتے جاتے وہ رکے اور مڑ کر کہنے لگے: "اور کوئی لڑکا یہاں قدم نہ رکھے--- حرامزادے" اور پیشکار صاحب منہ ہی منہ میں بڑبڑاتے ہوئے اندر چلے گئے-

دوسرے دن پیشکار صاحب گھر سے نکلے تو چلتے چلتے مرزا صاحب کے کوارٹر کے سامنے ٹھٹکے کہنے لگے: "مرزا صاحب میں نے تو خندق پٹوا دی ہے تم بھی پٹوا دو جنگ اب نہیں ہو گی"-

مرزا صاحب کو یہ مشورہ پسند نہیں آیا- مگر پیشکار صاحب دوسرے دن گزرتے ہوئے پھر رکے- خندق کو غور سے دیکھا اور پھر بولے "مرزا صاب مان جاؤ جی- بہت ہو گئی- خندق اب پٹوا دو"-

مرزا صاحب نے مشورے کو پھر رد کر دیا- تیسرے دن پیشکار صاحب گزرتے گزرتے رکے- مشورہ تو انہوں نے کوئی نہیں دیا- بس حیرت سے خندق کو دیکھتے رہے- پھر بولے "کمال ہے ' ابھی تک خندق کھدی ہوئی ہے"-

مرزا صاحب نے اس مرتبہ تو جواب دینے کی بھی ضرورت محسوس نہیں کی- خاموشی سے حقہ پیتے رہے اور پیشکار صاحب کو تکتے رہے- پیشکار صاحب نے خندق کو تھوڑی

دیر تک بنظر حیرت دیکھا اور آگے بڑھ گئے۔ بات یہ ہے کہ مرزا صاحب زیادہ بحث نہیں کرتے۔ شاید اس لئے ان کی اور پیشکار صاحب کی گفتگو کبھی لمبی نہیں کھنچی اور کبھی نہ دیکھا کہ پیشکار صاحب احاطہ میں آکر بیٹھے ہوں اور اطمینان سے باتیں کی ہوں ۔ ہمیشہ یہی دیکھا کہ پیشکار صاحب چلتے چلتے رکے۔ ایک بات ادھر سے ہوئی ایک بات ادھر سے ہوئی اور آگے بڑھ گئے۔ دونوں ہی کو وضع دار دیکھا۔ مرزا صاحب نے کبھی اندر آنے اور بیٹھنے کی دعوت نہیں دی۔ پیشکار صاحب کبھی اندر احاطہ میں آکر بیٹھے نہیں مگر انکا اب یہ روز مرہ کا معمول بن گیا تھا کہ گزرتے گزرتے رکتے اور کہتے کہ "مرزا صاحب مان لو ہماری بات۔ خندق اب پٹوا دو"۔

اس مشورے نے مرزا صاحب پر کبھی اثر نہیں کیا۔ انہوں نے خندق کو اسی طرح صاف ستھرا رکھا جس طرح جنگ کے دنوں میں رکھا تھا۔ ایک مرتبہ ایسا ضرور ہوا تھا کہ آس پاس کے کوارٹروں کے دو نٹ کھٹ لڑکے خندق کے کنارے آکھڑے ہوئے اور اپنی اپنی دھار کا مقابلہ کرنے لگے۔ مگر مرزا صاحب نے تنت موقع پر انہیں دیکھ لیا۔ وہ نٹ کھٹ لڑکے بھاگ لئے اور مرزا صاحب لالو مہترانی کو بلا کر لائے۔ اس نے نیچے اتر کر گیلی مٹی کو کھرچ دیا اور خندق پھر پاک وصاف ہو گئی۔ ایک دفعہ اس میں یہی نٹ کھٹ لڑکے ایک بلی کے بچے کو بھی ڈھکیل گئے تھے اور وہ کئی گھنٹے اس میں گرا پڑا میاؤں میاؤں کرتا رہا۔ خیر جب مرزا صاحب نے اسے باہر نکالا تو وہ ضرور مٹی میں اٹ گیا تھا۔ مگر خندق کی مٹی اس کے گوموت سے خراب نہیں ہوئی تھی۔ البتہ برابر کے کوارٹر کی اس چتی بلی نے تھوڑی خرابی ضروری کی تھی جو رات کے اندھیرے میں جانے کہاں سے ایک کبوتر منہ میں دبوچ کر اس خندق میں اتری اور سارا کبوتر چٹ کر کے پنجے پر اور سر وہاں چھوڑ گئی ۔ صبح کو جب مرزا صاحب نے خندق کا یہ احوال دیکھا تو خود اس میں اترے اور بڑی احتیاط سے ایک ایک پر چن کر خندق سے باہر پھینکا مگر کبوتر کے پروں اور پنجوں سے خندق خراب تو نہیں ہو سکتی تھی ۔ خراب تو وہ اس لمبے لجلجے کیچڑے سے بھی نہیں ہوئی تھی جو اوپر سے گزرتی ہوئی چیل کے پنجوں سے گر کر عین خندق کے اندر گرا تھا۔ ہاں خرابی یہ ہوئی کہ

جب مرزا صاحب چھچھوندرے کو باہر پھینک کر خندق سے نکل رہے تھے تو پیشکار صاحب عین اس وقت اس طرف سے گزرے۔ مرزا صاحب کے مٹی میں اٹے کپڑوں کو دیکھ کر مسکرائے اور بولے: "مرزا صاحب میں پھر کہتا ہوں کہ اب یہ خندق بند کرا دو"۔

مرزا صاحب نے پھر ہنس کر بات ٹال دی اور مونڈھے پر بیٹھ کر خاموشی سے حقہ پینا شروع کر دیا مگر اس روز جانے انہیں کیا ہو گیا حالانکہ اس روز بھی کوئی ایسی نئی بات تو نہیں ہوئی تھی۔ بس یہی تو ہوا تھا کہ پیشکار صاحب حسب معمول گزرتے گزرتے رکے۔ خندق کو دیکھا اور ہنسنے لگے۔ جب خوب ہنس چکے تو کہنے لگے: "مرزا صاحب اب فرماؤ جی میں نہ کہتا تھا کہ خندق بند کرا دو۔ سن لیا نا"۔

مرزا صاحب نے حقہ پیتے پیتے خاموشی سے پیشکار صاحب کو دیکھا اور آنکھیں بند کر لیں۔ جب وہ گزر گئے تو اخبار وہیں مونڈھے پر چھوڑ کر اٹھے اور اندر چلے گئے۔ مرزا صاحب کا معمول ہمیشہ یہ رہا کہ صبح ہوئی اور وہ حقہ تازہ کر، ہاتھ میں سنبھال اندر سے برآمدے سے مونڈھا اٹھا باہر احاطہ میں آبیٹھے۔ گرمی کے دن ہوئے تو چھاؤں میں جاڑے ہوئے تو دھوپ میں مونڈھا بچھایا۔ حقہ سامنے رکھا اور گزرتے ہوئے ہاکر سے اردو کا اخبار لے کر پڑھنا شروع کر دیا۔ جب کہیں دوپہر ہوئی تو اندر چلے گئے مگر آج تو وہ باہر آ کر بیٹھے تھے کہ اخبار کی ایک ڈیڑھ خبر کو دیکھ اٹھ کھڑے ہوئے اور اندر چلے گئے شاید پیشکار صاحب کی بات سے ان کی طبیعت منغض ہو گئی ہو یا شاید ان کی طبیعت ہی خراب ہو۔

مرزا صاحب دوپہر بعد کہیں پھر باہر آئے مگر ابھی مونڈھے پر بیٹھے ہی تھے کہ انہیں بدبو آنی شروع ہوئی۔ پہلے تو ان کی سمجھ میں نہ آیا کہ کہاں سے بو آ رہی ہے آخر انہوں نے خندق میں جھانکا کیا دیکھتے ہیں کہ ایک مرا ہوا چوہا پڑا ہے۔ سخت بے مزہ ہوئے بھاگ دوڑ کر کے لالو مہترانی کو گھیرا اور اس سے چوہا نکلوایا۔

جب چوہا نکال پھینکا گیا تو مرزا صاحب خندق کو ٹکٹکی باندھے دیکھتے رہے پھر انہوں نے نذیر کو بلا کر کہا: "نذیرا اس خندق کو پاٹ دو۔ اب یہ نجس ہو گئی"۔

دوسرے دن صبح کو پیشکار صاحب معمول کے مطابق کوارٹر کے سامنے رکے۔ مگر وہ

کچھ ٹھٹک سے گئے۔ خندق سچ مچ بند ہو چکی تھی۔ اس روز مرزا صاحب سے کوئی بات نہیں ہوئی۔ آنکھ سے آنکھ نہیں ملی۔ بس پیشکار صاحب گذر ہی گئے۔

پیشکار صاحب کا معمول جاری ہے۔ وہی صبح صبح گھر سے نکلنا اور ڈاکٹر صاحب کی دوکان کی طرف چل پڑنا۔ کبھی اس نکڑ پہ رک کر اس سے بات کرنا۔ کبھی اس نکڑ پر ٹھہر کر اس سے گفتگو کرنا۔ ہاں اب وہ مرزا صاحب کے کوارٹر کے سامنے نہیں رکتے۔ مرزا صاحب اب بھی روز صبح کو مونڈھا بچھا کر اور حقہ سامنے رکھ کر اخبار ہاتھ میں لے کر بیٹھتے ہیں۔ مگر خندق اب وہاں نظر نہیں آتی۔ جہاں خندق تھی وہاں اب چھوٹی چھوٹی گھاس اگی ہوئی ہے۔

(۱۹۶۸ء)

❁ = = = = = = = ❁

"بستی" اور "تذکرہ"

کے بعد

انتظار حسین کا نیا ناول

"آگے سمندر ہے"